سابقہ اور موجودہ

مسلمان امتوں کا ماضی، حال اور مستقبل

اور

مسلمانانِ پاکستان کی خصوصی ذمہ داری

ڈاکٹر اسرار احمد

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

36-K ماڈل ٹاؤن لاہور۔فون:3-35869501

www.tanzeem.org

عرضِ ناشر

زیرِ نظر کتاب محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے اُن مضامین کا مجموعہ ہے جو اپریل ۱۹۹۳ء سے جولائی ۱۹۹۳ء کے دوران ''تفکر و تذکر'' کے زیرِ عنوان روزنامہ ''نوائے وقت'' میں شائع ہوئے۔ اُمت کی زبوں حالی پر ہر دردمند دل رکھنے والے مسلمان کے دل میں پیدا ہونے والی اس خلش کہ ''ہیں آج کیوں ذلیل......؟'' کے تذکرے سے شروع ہونے والے یہ مضامین دراصل محترم ڈاکٹر صاحب کے خطبہ عیدالفطر کی تفصیل و تشریح کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس سال یہ خطبہ غیر معمولی طور پر طویل ہی نہیں، غیر معمولی اہمیت کا حامل بھی تھا اور اس کا عنوان تھا: ''اُمت مسلمہ پر عذابِ الٰہی کے سائے، مسیح دجال کی آمد آمد اور مسلمانانِ پاکستان کی ذِمہ داریاں!'' —— عیدالفطر سے متصلاً قبل محترم ڈاکٹر صاحب بیرونِ ملک سفر سے واپس تشریف لائے تھے اور اُن کے اس سفر میں امریکہ، فرانس اور سعودی عرب کے ساتھ ساتھ متحدہ عرب امارات کا مختصر دورہ بھی شامل تھا۔ چنانچہ اس سفر کے مشاہدات و تأثرات کا ایک عکس بھی ان کی زیرِ نظر تقریر و تحریر میں جھلکتا دکھائی دیتا ہے۔

بین الاقوامی حالات جس تیزی کے ساتھ تبدیل ہو رہے ہیں اور تاریخ جس برق رفتاری سے کروٹیں بدلنے لگی ہے، اس کے پیشِ نظر ملک و ملت کا درد رکھنے والا ہر شخص یہ سوچنے پر مجبور ہے کہ اُمت مسلمہ اور اسلام کا مستقبل کیا ہوگا! بادیُ النظر میں تو یہی دکھائی دیتا ہے کہ اسلام مخالف تمام قوتیں اب واحد سپر پاور امریکہ، جسے ایک اعتبار سے ''سپریم پاور'' کہنا بھی غلط نہ ہوگا، کے جھنڈے تلے مسلمانوں اور اسلام کے خلاف متحد ہو چکی ہیں، اور ستم ظریفی یہ کہ قوت و طاقت کے نشے میں سرشار اس سپر پاور کے سر پر ''یہودی'' سوار ہے جس کی مسلمان دشمنی محتاجِ بیان نہیں۔ اس تناظر میں صاف نظر آتا ہے کہ اُمت کا مستقبل نہایت تاریک ہے اور شدید اندیشہ ہے کہ دجالی فتنے کا یہ سیلاب مسلمانوں کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جائے گا۔ لیکن ہمارے لیے اصل غور طلب بات یہ ہے کہ کیا

اس تاریکی کے بعد کسی روشن صبح کے نمودار ہونے کا امکان ہے یا نہیں؟ کیا یہ شب تاریک کبھی جلوۂ خورشید سے گریزاں ہو سکے گی اور کیا کرۂ ارضی ایک بار پھر نغمۂ توحید سے معمور ہو سکے گا؟ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ آیا ہمارے لیے یہ طرزِ عمل کہ ہم ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظر فردا رہیں' کسی طور مناسب ہے؟ یا موجودہ حالات اور مستقبل کے حوالے سے ہم پر کوئی ذمہ داری بھی عائد ہوتی ہے؟ ان سوالات کا بڑا مفصل جواب محترم ڈاکٹر صاحب کی ان تحریروں میں موجود ہے۔ یہ مضامین دراصل سابقہ اور موجودہ مسلمان اُمتوں' یعنی یہود اور اُمت مسلمہ کے ماضی' حال اور مستقبل کے ضمن میں محترم ڈاکٹر صاحب کے افکار پر مشتمل ہیں۔ چنانچہ ان کے آئینۂ افکار میں' جو قرآن و حدیث کے نصوص پر مشتمل ہے' قارئین کو نہ صرف یہ کہ ماضی اور حال کا صحیح شعور و ادراک حاصل ہوتا ہے بلکہ آنے والے دَور کی ایک واضح تصویر بھی نظر آتی ہے۔ قارئین محسوس کریں گے کہ فکری و نظری گہرائی کے حامل ان مضامین میں جہاں جا بجا دقیق عالمانہ نکات موجود ہیں' وہاں عملی رہنمائی کا بھی وافر سامان موجود ہے۔

اس کتاب میں شامل بعض مباحث اس سے قبل ''تنظیم اسلامی کا تاریخی پس منظر'' نامی کتابچے میں بھی شامل تھے' لیکن اِس کتاب کے مخصوص سیاق و سباق میں ان کا شائع کرنا ضروری تھا۔ ویسے بھی اُس تحریر اور اس زیر نظر کتاب کے درمیان کم و بیش بیس سال کا فصل ہے' چنانچہ اس طویل فصل زمانی کے پیش نظر اِن میں بعض نئے پہلو بھی شامل کر دیے گئے ہیں جو یقیناً قارئین کی دلچسپی کا موجب ہوں گے۔

ناظم نشر و اشاعت

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

اکتوبر ۱۹۹۳ء

پ۔ن: طبع نہم (دسمبر 2008ء) کے موقع پر اس کتاب کو نئی کمپیوٹر کمپوزنگ کے ساتھ پیش کیا جا رہا ہے۔ نیز کتاب کے آخر میں دی گئی احادیث کے ساتھ اردو ترجمہ بھی شامل کر دیا گیا ہے۔

فہرست

بابِ اوّل

ہیں آج کیوں ذلیل......؟ 6

بابِ دوم

قرآن کا قانونِ عذاب 14

بابِ سوم

سابقہ اور موجودہ مسلمان اُمتیں

اور سابقہ اُمت کی دو ہزار سالہ تاریخ کے چار اَدوار 23

بابِ چھارم

موجودہ اُمت مسلمہ کی چودہ سو سالہ تاریخ کے چار اَدوار 31

بابِ پنجم

بیسویں صدی عیسوی ——— سابقہ اور موجودہ مسلمان اُمتیں 40

بابِ ششم

ابراہیمی مذاہب کا ''ثالثِ ثلاثہ'' 55

بابِ ھفتم

''آنے والے دَور'' کی ایک واضح تصویر 69

بابِ ھشتم

اسلام کا عالمی غلبہ یا عالمی نظامِ خلافت 76

بابِ نھم

اب تک کے مباحث کا خلاصہ 85

۞ **بابِ دھم**

پندرھویں صدی ہجری: توقعات اور اندیشے 91

۞ **بابِ یازدھم**

دو شبہات اور اُن کے جواب 106

۞ **بابِ دوازدھم**

خلیج کی جنگ: ''جنگوں کی ماں''؟ 115

۞ **بابِ سیزدھم**

ملت اسلامیہ پاکستان کی خصوصی ذمہ داری 130

۞ **بابِ چھاردھم**

پاکستان کا مستقبل 139

۞ **بابِ پانزدھم**

ہماری نجات کا واحد ذریعہ: اجتماعی توبہ 154

۞ **ضمیمہ**

اس کتاب میں مذکور احادیث کی تخریج 164

باب اوّل

ہیں آج کیوں ذلیل......؟

۲۲ جنوری ۱۹۹۳ء کو نیو جرسی سٹیٹ کے صنعتی شہر ٹرینٹن میں خطابِ جمعہ کے لیے ذہن تانا بانا بننے میں مصروف تھا کہ اچانک بجلی کوندنے کے سے انداز میں یہ تلخ حقیقت سامنے آئی کہ ہم سورۃ البقرۃ کی آیت ۶۱ میں واردشدہ الفاظ ﴿ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ ۚ وَبَاءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ؕ﴾ ''اُن پر ذلت اور مسکنت تھوپ دی گئی' اور وہ اللہ کے غضب میں گھر گئے!'' گو پڑھتے ہوئے اطمینان سے گزر جاتے ہیں' اس لیے کہ یہ الفاظ یہودیوں کے بارے میں وارد ہوئے ہیں' لیکن اگر موجودہ حالات کا معروضی مطالعہ کیا جائے تو اِس وقت اِن الفاظِ قرآنی کے مصداقِ کامل مسلمان ہیں نہ کہ یہود! (واضح رہے کہ ذرا سی تقدیم وتأخیر کے ساتھ یہ مضمون سورۂ آل عمران کی آیت ۱۱۲ میں بھی وارد ہوا ہے)۔[۱] اسی طرح سورۃ الفاتحہ کی آخری آیت کی تفسیر کے ضمن میں اس امر پر مفسرین کا تقریباً اجماع ہے کہ ''مَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ'' کی عملی تفسیر یہود ہیں اور ''ضَآلِّيْن'' کے مصداق نصاریٰ ہیں' جب کہ واقعہ یہ ہے کہ اگرچہ مؤخر الذکر یعنی عیسائیوں کا گمراہ ہونا تو یقیناً اب بھی صدفی صد درست ہے' لیکن ''مَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ'' کی عملی تفسیر تو اِس وقت یہود نہیں' مسلمان ہیں۔

ذرا غور فرمائیے کہ یہودی اِس وقت پوری دنیا میں کل چودہ ملین یعنی لگ بھگ ڈیڑھ کروڑ ہیں' جب کہ مسلمانوں کی تعداد کم از کم تیرہ سو ملین یعنی ایک ارب تیس کروڑ ہے۔ گویا مسلمان یہودیوں سے تعداد میں تقریباً سو گنا زیادہ ہیں۔ اس کے باوجود اِس وقت کرۂ ارضی

---

(۱) ﴿ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ اَيْنَ مَا ثُقِفُوْٓا اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ وَبَاءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ ؕ﴾

کی سیاسی قسمت بالفعل یہود کے ہاتھ میں ہے' اس لیے کہ وہ علامہ اقبال کے قول ع ''فرنگ کی رگِ جاں پنجۂ یہود میں ہے!'' کے مصداق وقت کی ''واحد سپریم پاور'' یعنی ریاست ہائے امریکہ کی سیاست' معیشت اور ثقافت' سب پر پوری طرح قابض اور قابو یافتہ ہیں' اور امریکہ کا صدر ہو یا سینٹ' اور کانگریس ہو یا پینٹا گون' سب ان کے اثر و رسوخ اور بالخصوص ذرائع ابلاغ پر ان کے کنٹرول کے آگے بے بس ہیں۔ دوسری طرف سونے چاندی کی بجائے کاغذی کرنسی کے رواج اور بینک' انشورنس اور اسٹاک ایکسچینج کے شیطانی جال پر تسلط کے ذریعے اِس وقت دنیا کی دولت کے بڑے حصے پر یہود کا قبضہ ہے۔ چنانچہ ایک جانب ان میں سے بیسیوں افراد ایسے موجود ہیں جو کئی کئی بلین ڈالر کا ایک ایک چیک جاری کر سکتے ہیں تو دوسری جانب عالمی اقتصادیات کا لیور یا ہینڈل ان کے ہاتھ میں ہے کہ جب چاہیں اور جہاں چاہیں مالی بحران پیدا کر کے دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت کو ریزہ ریزہ کر دیں۔ (سوویت یونین کا یہ حشر تو سامنے کی بات ہے ہی' جیسے ہی صیہونیوں نے محسوس کیا کہ امریکہ ان کی راہ میں رکاوٹ بن رہا ہے' وہ آناً فاناً یہی معاملہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے ساتھ بھی کر سکتے ہیں' اور غالباً وہ وقت اب زیادہ دور بھی نہیں ہے۔ واللہ اعلم!)

یہود کا یہ سیاسی اور معاشی اثر و نفوذ تو ذرا پس پردہ اور عام لوگوں کی نگاہوں سے مخفی ہے' لیکن اُمت مسلمہ سے تقابل کے اعتبار سے یہ حقیقت تو اظہر من الشمّس ہی ہے کہ عالم اسلام' خصوصاً عالم عرب کے سینے میں اسرائیل کا خنجر بالفعل پیوست ہے۔ (واضح رہے کہ دریائے اردن کے مغربی کنارے' گولان کی سطح مرتفع اور غزہ کی پٹی سے قطع نظر' جس پر ۱۹۶۷ء کی جنگ میں اسرائیل قابض ہوا' ۱۹۴۸ء میں جو ابتدائی اسرائیل وجود میں آیا تھا اس کی صورت واقعتاً بالکل خنجر کی سی ہے!) اس پر مستزاد یہ کہ دیکھنے والی نگاہیں دیکھ رہی ہیں کہ ''وسیع تر اسرائیل'' بھی بالقوہ وجود میں آ چکا ہے' اس لیے کہ دنیائے اسلام بالخصوص عالم عرب میں کوئی طاقت ایسی موجود نہیں ہے جو اِس کے قیام کی راہ میں مزاحم ہو سکے! (یہ بالکل دوسری بات ہے کہ صیہونیوں کی اپنی حکمت عملی ابھی اپنے آخری اقدام کے ضمن میں قدرے تأخیر کی متقاضی ہو!)۔

اس کے بالکل برعکس صورت حال مسلمانوں کی ہے کہ تعداد میں سوا ارب سے زائد ہونے کے باوجود ع ''کس نمی پرسد کہ بھیا کیستی'' کے مصداق بین الاقوامی سطح پر ان کی رائے کی کوئی حیثیت نہیں۔ سارے عالمی معاملات G-7 یا زیادہ سے زیادہ G-15 طے کرتے ہیں' اور بین الاقوامی مسائل میں سارے اقدامات کا فیصلہ یو این او اور اس کی سیکیورٹی کونسل کے پردے میں صرف امریکہ اور اس کے چند حواری (بالخصوص انگلستان اور فرانس) کرتے ہیں۔ ہمارے بڑے بڑے ملکوں اور بڑی شان و شوکت کی حامل حکومتوں کے جملہ معاملات بھی کہیں اور طے ہوتے ہیں' ہماری داخلی اور خارجی حکمت عملی کہیں اور بنتی ہے' یہاں تک کہ ملکی بجٹ اور ٹیکسوں کے ضمن میں ''ہدایات'' باہر سے آتی ہیں۔ مزید برآں ہمارے وسائل پر بالفعل اغیار کا قبضہ ہے اور ہمارے دولت مند ترین ملکوں کی تمام تر دولت بھی اصلاً غیروں کے دست اختیار میں ہے کہ اگر ذرا ان کی مرضی کے خلاف ادنیٰ جنبش بھی کریں تو چشم زدن میں ان کی کل دولت اور سرمایہ ''منجمد'' کر کے گویا صفر بنا کر رکھ دیں۔ الغرض ہماری کیفیت اس وقت بالکل وہی ہے جس کا نقشہ نبی اکرم ﷺ نے اپنی ایک حدیث مبارک (رواہ احمد وابوداؤد عن ثوبانؓ) میں کھینچا تھا کہ ''مجھے اندیشہ ہے کہ ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ نہایت کثیر تعداد میں ہونے کے باوجود تمہاری حیثیت سیلاب کے ریلے کے اوپر کے جھاگ سے زیادہ نہیں رہے گی۔''(۱)

ان ''لطیف'' حقائق پر مستزاد یہ تلخ واقعات تو نگاہوں کے عین سامنے موجود ہیں کہ مغرب ہو یا مشرق' اِس وقت ساری دنیا میں مسلمان شدید ترین مصائب و آلام سے دوچار ہیں۔ چنانچہ مشرق میں بھارت اور کشمیر اور مغرب میں بوسنیا ہرزیگووینا تو بالفعل ع ''ہو گیا مانندِ آب ارزاں مسلماں کا لہو'' کا نقشہ پیش کر رہے ہیں' باقی عالم اسلام بھی یا تو افغانستان اور تاجکستان کی طرح خانہ جنگی کے عذاب میں مبتلا ہے یا سورۃ النحل کی آیت ۱۱۲ میں وارد شدہ الفاظ ''لِبَاسَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ'' کے مطابق بھوک اور خوف کے لباس میں ملبوس نظر آتا ہے' اور جہاں بظاہر اِن دونوں میں سے کوئی صورت موجود نہیں ہے' بلکہ دولت کی ریل

(۱) احادیث کا مکمل متن اور ترجمہ کتاب کے آخر میں دیے گئے ''ضمیمہ'' میں ملاحظہ فرمائیے!

پیل اور عمارتوں کی شان وشوکت یورپ ہی نہیں امریکہ کا مقابلہ کرتی نظر آتی ہے‘ وہاں بھی ’’ذلت ومسکنت‘‘ کی یہ صورت بتمام وکمال موجود ہے کہ بین الاقوامی سطح پر نہ عزت ہے نہ وقار‘ اور خود داخلی سطح پر بھی حقیقی آزادی حاصل ہے نہ واقعی اختیار۔ چنانچہ ایک جانب ’’ذلت‘‘ کی انتہا یہ ہے کہ مغرب کے اخبارات وجرائد میں ان دولت مندترین مسلمانوں کا تذکرہ بالعموم تمسخر اور استہزاء کے ساتھ ہوتا ہے‘ تو دوسری جانب ’’مسکنت‘‘ اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ بھارت میں بابری مسجد کے گرائے جانے پر پچاس سے زائد نام نہاد مسلمان حکومتوں میں سے کسی ایک کو بھی یہ جرأت نہیں ہوئی کہ بھارت کی حکومت سے یہ ہی کہہ سکتی کہ اگر مسجد فی الفور دوبارہ تعمیر نہ کی گئی تو ہم سفارتی یا اس سے بھی کم تر درجہ میں تجارتی تعلقات منقطع کر لیں گے۔ گویا عزت ووقار کے ساتھ ساتھ غیرتِ ملی کا جنازہ بھی نکل چکا ہے اور سوا ارب سے زیادہ افراد پر مشتمل عالمی ملت اسلامیہ اس وقت بالفعل ع ’’حمیت نام تھا جس کا گئی تیمور کے گھر سے‘‘ کا نقشہ پیش کر رہی ہے‘ تو سوچئے کہ الفاظِ قرآنی ﴿ضُرِبَتْ عَلَیْھِمُ الذِّلَّۃُ وَالْمَسْکَنَۃُ ق وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰہِ ط﴾ یعنی ’’ان پر ذلّت اور مسکنت مسلط کر دی گئی اور وہ اللہ کے غضب میں گھر گئے‘‘ کے مصداق اِس وقت ہم نام نہاد مسلمان ہیں یا یہود؟

آگے بڑھنے سے قبل اس خیال کے تحت کہ مبادا مایوسی اور بددلی کے سائے زیادہ گہرے ہو جائیں‘ اور مبادا کسی کے دل میں یہ وسوسہ پیدا ہو جائے کہ قرآن کے بیان میں کسی شک وشبہ کی گنجائش ہے‘ یہ حقیقت بیان کر دینی ضروری ہے کہ موجودہ صورتِ حال مستقل نہیں عارضی ہے‘ اور مستقبل میں بالکل برعکس ہو جائے گی۔ چنانچہ قرآن حکیم میں قوموں اور اُمتوں کے عروج وزوال کے جو اصول اور عذابِ الٰہی کا جو فلسفہ بیان ہوا ہے اور اس پر مستزاد احادیث نبویہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں قربِ قیامت کے جو حالات و واقعات اور یہود ونصاریٰ اور مسلمانوں کے مابین آخری آویزش اور معرکہ آرائی کے ضمن میں جو پیشین گوئیاں وارد ہوئی ہیں‘ ان کے مطابق یہود پر بہت جلد ’’عذابِ استیصال‘‘ یعنی جڑ سے اکھیڑ پھینکنے والا عذاب نازل ہوگا (اس اصطلاح کی وضاحت بعد میں ہوگی)‘ اور وہ

"عظیم تر اسرائیل"، جس کے خواب وہ عرصے سے دیکھ رہے ہیں، اگرچہ ایک بار قائم تو ہو جائے گا لیکن بالآخر وہی ان کا عظیم تر اجتماعی قبرستان بنے گا۔ دوسری جانب پورے کرۂ ارضی پر بالآخر اُمت محمد علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی حکومت قائم ہوگی اور اللہ کے دین کا بول بالا ہوگا۔ گویا موجودہ نیو ورلڈ آرڈر، جو درحقیقت جیو ورلڈ آرڈر (یعنی یہودیوں کی بالا دستی کا عالمی نظام) ہے، بالآخر اسلام کے "جسٹ ورلڈ آرڈر" (Just World Order) یعنی خلافت علیٰ منہاج النبوت کے عدل وقسط پر مبنی عالمی نظام میں تبدیل ہو کر رہے گا۔

چنانچہ صحیح مسلم میں حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((اِنَّ اللّٰہَ زَوٰی لِیَ الْاَرْضَ فَرَاَیْتُ مَشَارِقَھَا وَمَغَارِبَھَا، وَاِنَّ اُمَّتِیْ سَیَبْلُغُ مُلْکُھَا مَا زُوِیَ لِیْ مِنْھَا))

"اللہ نے مجھے پوری زمین کو لپیٹ کر (یا سکیڑ کر) دکھا دیا۔ چنانچہ میں نے اس کے سارے مشرق بھی دیکھ لیے اور تمام مغرب بھی۔ اور یقین رکھو کہ میری اُمت کی حکومت ان تمام علاقوں پر قائم ہو کر رہے گی جو مجھے لپیٹ کر (یا سکیڑ کر) دکھائے گئے۔"

اسی طرح مسند احمد بن حنبل میں حضرت مقداد بن الاسود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((لَا یَبْقٰی عَلٰی ظَھْرِ الْاَرْضِ بَیْتُ مَدَرٍ وَّلَا وَبَرٍ اِلَّا اَدْخَلَہُ اللّٰہُ کَلِمَۃَ الْاِسْلَامِ بِعِزِّ عَزِیْزٍ وَذُلِّ ذَلِیْلٍ، اِمَّا یُعِزُّھُمُ اللّٰہُ فَیَجْعَلُھُمْ مِّنْ اَھْلِھَا اَوْ یُذِلُّھُمْ فَیَدِیْنُوْنَ لَھَا))

"روئے زمین پر نہ کوئی اینٹ گارے کا بنا ہوا گھر باقی رہے گا نہ کمبلوں کا بنا ہوا خیمہ جس میں اللہ اسلام کو داخل نہیں کر دے گا، خواہ عزت والے کے اعزاز کے ساتھ خواہ کسی مغلوب کی مغلوبیت کی صورت میں۔ (یعنی) یا لوگ اسلام قبول کر کے خود بھی عزت کے مستحق بن جائیں گے یا اسلام کی بالا دستی تسلیم کر کے اس کی فرماں برداری قبول کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔"

لہٰذا ہم الصادق والمصدوق ﷺ کے فرمودات پر یقین کی بنا پر ایک جانب موجودہ عالمی نظام کے سربراہوں، یعنی یہود اور نصاریٰ سے کہہ سکتے ہیں کہ:۔

''اور بھی دَورِ فلک ہیں ابھی آنے والے
ناز اتنا نہ کریں ہم کو ستانے والے!''

اور دوسری جانب معروضی حالات کے مطالعے اور مشاہدے کے باعث جب اُمید کا دامن ہاتھ سے چھوٹتا محسوس ہو اور مایوسی کے سائے زیادہ گہرے ہونے لگیں تو۔

''سنبھلنے دے مجھے اے ناامیدی کیا قیامت ہے
کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے!''

اور۔

''نہ ہو نومید، نومیدی زوالِ علم و عرفاں ہے
امید مردِ مؤمن ہے خدا کے راز دانوں میں!''

کے مصداق ''دامانِ خیالِ یار'' کی طرح دامن امید پر اپنی گرفت از سرِ نو مضبوط کر سکتے ہیں۔
لیکن علامہ اقبال کے اس شعر کے مطابق کہ۔

''مسلم استی سینہ را از آرزو آباد دار
ہر زماں پیشِ نظر لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَاد دار!''

اس آخری اُمید سے اپنے سینے کو آباد رکھنے کے ساتھ ساتھ دو اسباب کی بنا پر لازم ہے کہ ہم ان سوالات کے جواب قرآن کے فلسفہ و حکمت کی روشنی میں تلاش کریں کہ اس وقت۔

''ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیٔ فرشتہ ہماری جناب میں!''

کے مصداقِ کامل ہم مسلمان ہی کیوں بن گئے ہیں اور اس کا کیا سبب ہے کہ۔

رحمتیں ہیں تری اغیار کے کاشانوں پر
برق گرتی ہے تو بیچارے مسلمانوں پر!

اس لیے کہ ایک عام سادہ لوح مسلمان کی سوچ تو لامحالہ یہ ہے کہ ہم خواہ اَفعال و اَعمال اور

اَخلاق وکردار کے اعتبار سے کتنی ہی پستی میں گر چکے ہوں‘ بہرحال کلمہ گو اور خاتم النبیین اور سید المرسلین ﷺ کے اُمتی ہیں اور ’’توحید کی امانت‘‘ کے حامل اور ع ’’ہر کہ عشق مصطفیٰ سامانِ اوست‘‘ کے کسی نہ کسی درجے میں مدعی ہیں‘ جبکہ یہود و نصاریٰ اور بقیہ جملہ اقوامِ عالم کھلم کھلا کافر و مشرک اور اللہ اور اس کے رسولؐ کی صاف منکر و مخالف ہیں‘ اور قرآن مجید میں بار بار فرمایا گیا ہے کہ ’’اللہ کافروں کو پسند نہیں کرتا۔‘‘

ان سوالات پر قرآن و حدیث کی روشنی میں سنجیدگی سے غور اِن اسباب کی بنا پر لازمی ہے کہ:

(۱) جیسے قرآنِ مجید میں بار بار نبی اکرم ﷺ سے کہلوایا گیا کہ ’’لوگو! جس بات کی تمہیں خبر دی جارہی ہے یا جس عذاب کی وعید سنائی جارہی ہے‘ میں نہیں جانتا کہ وہ قریب ہے یا ابھی کچھ دور ہے‘‘۔ (جیسے مثلاً سورۃ الانبیاء کی آیت ۱۰۹ میں اور سورۃ الجن کی آیت ۲۵ میں) اسی طرح نہیں کہا جاسکتا کہ عذابِ استیصال کے ذریعے یہود کے خاتمے اور عالمی سطح پر اسلام اور مسلمانوں کے غلبے کا ’’انقلابِ عظیم‘‘ قریب آ چکا ہے یا ابھی کچھ دیر تک موجودہ صورت ہی برقرار رہے گی۔ بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر چونکہ احادیث نبویہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام ہی سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ع ’’اور کچھ روز فضاؤں سے لہو برسے گا‘‘ کے مصداق ابھی موجودہ صورتِ حال مزید گھمبیر ہوگی اور اُمت مسلمہ پر عذابِ الٰہی کے مزید اور شدید تر کوڑے برسیں گے‘ لہٰذا ضروری ہے کہ موجودہ صورتِ حال کے اسباب اور قرآن کے فلسفۂ عذاب کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے‘ تاکہ سورۃ الشوریٰ کی آیت ۳۰ ﴿وَمَا اَصَابَکُمْ مِّنْ مُّصِیْبَۃٍ فَبِمَا کَسَبَتْ اَیْدِیْکُمْ وَیَعْفُوْا عَنْ کَثِیْرٍ ﴿۳۰﴾﴾ ’’اور جو مصیبت بھی تم پر نازل ہوتی ہے وہ تمہارے اپنے ہاتھوں کے کرتوتوں کے باعث ہوتی ہے‘ اور اللہ بہت سی کوتاہیوں سے تو درگزر بھی کرتا رہتا ہے!‘‘ کے مطابق یہ حقیقت پوری طرح واضح ہو جائے کہ یہ حالات و کیفیات ع ’’اے بادِ صبا ایں ہمہ آوردۂ تست!‘‘ کے مصداق ہماری اپنی بے عملی ہی نہیں بداعمالی کا نتیجہ ہیں تاکہ نہ ہم ﴿اَلظَّآنِّیْنَ بِاللّٰہِ ظَنَّ السَّوْءِ ؕ﴾ (الفتح:۶)

یعنی اللہ سے بدظنی کرنے والوں کے زمرے میں شامل ہوں‘ نہ ہمارے دلوں میں اللہ سے کوئی شکوہ شکایت پیدا ہو‘ بلکہ اپنی خطاؤں کے اعتراف کے ساتھ حقیقی پشیمانی اور خشوع و خضوع اور تضرع واخبات کی کیفیات پیدا ہوں جو توبہ کی لازمی شرائط ہیں!

(۲) جیسے ہر جسمانی عارضے کے صحیح علاج کے لیے مرض کی صحیح تشخیص لازمی ہے‘ اسی طرح ضروری ہے کہ اُمت کی موجودہ زبوں حالی کے اصل اسباب کا صحیح تعین کیا جائے‘ تاکہ ہماری قوتیں اور توانائیاں اور وقت کی قیمتی متاع سطحی قسم کی تدابیر میں ضائع نہ ہو جائیں‘ بلکہ ہم صورتِ حال کی سنگینی کے صحیح ادراک اور اُمت کے مزمن اور پیچیدہ امراض کے گہرے اسباب وعوامل کا صحیح شعور حاصل کر کے ان کے مداوا اور معالجہ کے لیے صحیح اور مؤثر تدابیر اختیار کر سکیں‘ اور اس تلخ حقیقت کے اعتراف کے ساتھ کہ اس وقت ہم بحیثیت اُمت عذابِ الٰہی کی گرفت میں ہیں‘ اس سے رستگاری کے حصول اور اللہ کے عفوو مغفرت کے دامن میں آنے کے لیے صحیح طریق کار پر عمل پیرا ہو سکیں۔ لہٰذا اِن شاء اللہ العزیز آئندہ سطور میں ’’قرآن کے فلسفۂ عذاب‘‘ پر کسی قدر وضاحت کے ساتھ گفتگو ہوگی۔

(۱۲/اپریل ۱۹۹۳ء)

باب دوم

قرآن کا قانونِ عذاب

ہمارا ایمان ہے کہ اس کائنات میں ایک پتہ بھی اللہ کے اِذن کے بغیر جنبش نہیں کر سکتا۔ ساتھ ہی ہمیں یہ بھی پورے یقین کے ساتھ معلوم ہے کہ یہاں جو کچھ ہوتا ہے اللہ کے اُن اٹل قوانین اور قواعد وضوابط یعنی قرآنِ حکیم کی اصطلاح میں اللہ کی اس ''سنت'' کے تحت ہوتا ہے جس میں کوئی تغیر وتبدل ممکن نہیں۔ جیسے کہ فرمایا سورۃ الاحزاب کی آیت ۶۲ میں کہ:

﴿وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ۝۶۲﴾

''اور تم ہرگز نہ پاؤ گے اللہ کی سنت میں کوئی تبدیلی!''

بعینہٖ یہی مضمون سورۂ فاطر کی آیت ۴۳ اور سورۃ الفتح کی آیت ۲۳ میں بھی وارد ہوا ہے۔ لہٰذا اگر آج پوری دنیا میں مسلمان شدید مصائب اور آلام سے دوچار ہیں تو یہ بھی یقیناً اللہ تعالیٰ کے کسی قانون یعنی اس کی اٹل اور مستقل سنت کے تحت ہو رہا ہے۔ اور اگر ہم دل سے چاہتے ہیں کہ یہ صورتِ حال تبدیل ہو تو لازم ہے کہ قرآن حکیم پر تدبر اور تفکر کے ذریعے اللہ کے قانونِ عذاب کو سمجھنے کی کوشش کریں' اس لیے کہ اسی پر اصلاحِ احوال کی صحیح اور مؤثر تدابیر کے فہم وشعور کا انحصار اور دارومدار ہے۔

قرآنِ حکیم کے عام اسلوب کے مطابق اس کا ''قانونِ عذاب'' بھی کہیں پورے کا پورا یکجا بیان نہیں ہوا ہے' بلکہ اس کی مختلف دفعات متفرق طور پر مختلف مقامات پر وارد ہوئی ہیں۔ اور اگر اِن سب کو جمع اور مرتب کر کے ان کی پشت پر کارفرما حکمت سمیت بیان کرنے کی کوشش کی جائے تو بات کچھ یوں بنتی ہے کہ:

(۱) یہ دنیا بنیادی طور پر دار العذاب نہیں دار الامتحان ہے' اور جزا و سزا کا معاملہ اصلاً

دنیا سے نہیں آخرت سے متعلق ہے۔ چنانچہ اس حیاتِ انسانی میں سے جو علامہ اقبال کے اس قول کے مطابق کہ ؎

''تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں' پیہم دواں' ہر دم جواں ہے زندگی!''

اتنی طویل ہے کہ دنوں' مہینوں اور سالوں کیا صدیوں میں بھی نہیں ناپی جاسکتی' موت کا ایک وقفہ ڈال کر: (؎ ''موت اِک زندگی کا وقفہ ہے۔ یعنی آگے بڑھیں گے دم لے کر!'') جو نہایت مختصر اور حقیر سا حصہ ''حیاتِ دُنیوی'' کی صورت میں علیحدہ کرلیا گیا ہے' اس کی اصل غرض و غایت آزمائش اور امتحان و ابتلاء ہے۔ جیسے کہ فرمایا گیا سورۃ الملک کی آیت ۲ میں کہ:

﴿ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ﴾

''اُس نے بنائی موت اور زندگی تا کہ تمہیں آزمائے کہ کون ہے تم میں سے اچھے عمل کرنے والا۔''

جس کی بہترین ترجمانی کی ہے علامہ اقبال نے اپنے اس شعر میں کہ ؎

قلزمِ ہستی سے تو اُبھرا ہے مانندِ حباب
اس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی!

اس امتحان میں انسان کی کامیابی یا ناکامی کا فیصلہ قیامت کے دن ہوگا' جہاں اگرچہ اس غرض کے لیے تو قوموں اور اُمتوں کی اجتماعی پیشی بھی ہوگی کہ ان کی جانب مبعوث کیے جانے والے رسول استغاثے کے گواہوں کی حیثیت سے ان پر حجت قائم کرسکیں کہ ہم نے تو تمہیں اللہ کا پیغام پہنچانے کا حق ادا کر دیا تھا' اب اپنے طرزِ عمل کے لیے تم خود جوابدہ ہو' تاہم اصل محاسبہ ہر انسان کا خالص انفرادی حیثیت پر ہوگا۔ جیسے کہ فرمایا سورۂ مریم کی آیت ۹۵ میں کہ:

﴿ وَكُلُّهُمْ اٰتِيْهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَرْدًا ۝۹۵ ﴾

''اور ان میں سے ہر شخص قیامت کے دن اللہ کے حضور میں پیش ہوگا فرداً فرداً

(یعنی اکیلا اکیلا)۔''

گویا انفرادی سطح پر کسی انسان پر جو مصیبتیں حیاتِ دُنیوی کے دوران نازل ہوتی ہیں وہ امتحان اور آزمائش کی غرض سے ہوتی ہیں' عذاب یا سزا کے طور پر نہیں۔ اس قاعدۂ کلیہ میں صرف ایک استثناء' جو بعض احادیث نبویہؐ سے معلوم ہوتا ہے' یہ ہے کہ بعض اوقات اللہ تعالیٰ اپنے کسی نیک اور مقبول بندے کو دنیا میں کسی تکلیف میں اس لیے مبتلا کر دیتا ہے کہ اسے اس کی کسی خطا کا کفارہ بنا دے' تا کہ وہ آخرت کی سزا سے بچ جائے۔ تاہم منطق کے عام قاعدے کے مطابق اس استثناء سے قاعدۂ کلیہ ختم نہیں ہوتا۔

(۲) البتہ اس قاعدۂ کلیہ کا کامل اطلاق صرف افراد پر انفرادی حیثیت سے ہوتا ہے۔ قوموں اور اُمتوں کا معاملہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ ان کی اجتماعی غلط روی اور مجموعی بداعمالی کی سزا اکثر و بیشتر اس دنیا میں دے دی جاتی ہے۔ چنانچہ بالکل صحیح فرمایا ہے علامہ اقبال نے کہ

فطرت افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے
نہیں کرتی کبھی ملت کے گناہوں کو معاف!

اور قوموں اور اُمتوں پر وارد ہونے والے اس اجتماعی عذاب کا تلخ ترین پہلو یہ ہے کہ اس میں گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس جاتا ہے' یعنی گناہ گاروں کے ساتھ ساتھ بے گناہ بھی عذاب کا نوالہ بن جاتے ہیں۔ جیسے فرمایا سورۃ الانفال کی آیت ۲۵ میں کہ:

﴿وَاتَّقُوۡا فِتۡنَةً لَّا تُصِيۡبَنَّ الَّذِيۡنَ ظَلَمُوۡا مِنۡكُمۡ خَآصَّةً‌ ۚ وَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيۡدُ الۡعِقَابِ ۝۲۵﴾

''اور ڈرو اُس وبال سے جو تم میں سے صرف ظالموں ہی کو لاحق نہیں ہوگا' اور جان رکھو کہ اللہ سزا دینے میں بہت سخت ہے۔''

اگرچہ اس میں بھی اللہ تعالیٰ نے اپنے خصوصی فضل و کرم سے ایک استثناء کی اُمید دلائی ہے' یعنی یہ کہ کسی قوم یا اُمت پر وارد ہونے والے اجتماعی عذاب سے ان لوگوں کے بچنے کی امید

کی جا سکتی ہے جو نہ صرف یہ کہ خود بدی سے اجتناب کرتے رہیں' بلکہ اپنی قوم کو غلط روش اور اللہ کی معصیت اور نافرمانی سے روکنے میں ایڑی چوٹی کا زور صرف کر دیں' جیسے کہ سورۃ الاعراف میں اصحاب السبت پر نازل ہونے والے عذاب کے ضمن میں فرمایا:

﴿اَنۡجَیۡنَا الَّذِیۡنَ یَنۡهَوۡنَ عَنِ السُّوۡءِ﴾ (آیت۱۶۵)

''ہم نے بچا لیا ان لوگوں کو جو بدی سے روکتے رہے تھے۔''

(۳) قوموں اور اُمتوں پر دنیا میں نازل ہونے والے عذاب کی بدترین اور شدید ترین صورت وہ ہے جس سے وہ قومیں دوچار ہوئیں جن کی جانب اللہ نے اپنے رسولوں کو مبعوث فرمایا اور انہوں نے ان پر اپنی دعوت و تبلیغ میں سعیٔ بلیغ فرما کر اور حق کی قولی و عملی شہادت میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ رکھ کر اتمامِ حجت کا حق ادا کر دیا۔ اس کے باوجود اُن کی قوموں نے بحیثیتِ مجموعی ان کی دعوت کو ردّ کر دیا اور حق کی راہ اختیار نہ کی تو ان پر ''عذابِ استیصال'' نازل ہوا۔ یعنی صرف رسولوں اور اُن معدودے چند لوگوں کو بچا کر جو اُن پر ایمان لائے' باقی پوری پوری قوموں کی جڑ کاٹ ڈالی گئی' یعنی انہیں نیست و نابود اور نسیاً منسیاً کر دیا گیا۔ چنانچہ قرآن کا ہر قاری بخوبی واقف ہے کہ اسی عذابِ استیصال یا عذابِ اکبر کی مثالیں ہیں وہ عذاب جو قومِ نوحؑ' قومِ صالحؑ' قومِ لوطؑ' قومِ شعیبؑ اور آلِ فرعون پر نازل ہوئے' جن کے نتیجے میں کہیں تو ارشاد ہوتا ہے کہ: ﴿کَاَنۡ لَّمۡ یَغۡنَوۡا فِیۡهَا ؕ﴾ (ھود ٦٨ اور ٩٥) ''وہ ایسے ہو گئے جیسے کبھی تھے ہی نہیں!'' کہیں فرمایا گیا کہ: ﴿لَا یُرٰۤی اِلَّا مَسٰکِنُهُمۡ ؕ﴾ (الاحقاف:٢٥) ''ان کے مکانوں اور مسکنوں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا''۔ یعنی ان کے مکین نیست و نابود ہو گئے! اور کہیں ارشاد ہوتا ہے کہ: ﴿فَقُطِعَ دَابِرُ الۡقَوۡمِ الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا ؕ﴾ (الانعام:٤٥) ''پس ان ظالموں کی جڑ کاٹ ڈالی گئی''۔

واضح رہے کہ اس نوع کے عذاب کے ضمن میں قرآن نے ایک سے زائد مرتبہ وضاحت اور صراحت کی ہے کہ یہ کسی رسول کی بعثت کے ذریعے اتمامِ حجت کے بعد ہی نازل کیا جاتا ہے۔ چنانچہ سورۂ بنی اسرائیل میں اسی نوع کے عذاب کے بارے میں فرمایا

گیا ہے کہ:

﴿وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا ﴿١٥﴾﴾

''اور ہم عذاب بھیجنے والے نہیں ہیں جب تک کسی رسول کو مبعوث نہ کر دیں۔''

اور سورۃ القصص کی آیت ۵۹ میں بھی یہی قاعدۂ کلیہ بیان ہوا کہ:

﴿وَمَا كَانَ رَبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى حَتّٰى يَبْعَثَ فِيْٓ اُمِّهَا رَسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ۚ﴾

''اور آپ کے ربّ کی شان یہ نہیں ہے کہ وہ بستیوں کو ہلاک کر دے جب تک ان کے مرکزی مقام پر ایک رسول نہ بھیج دے جو انہیں ہماری آیات سنا دے۔''

اس عذابِ استیصال یا عذابِ اکبر کے ضمن میں اللہ کی یہ سنت بھی قرآن میں بار بار بیان ہوئی ہے کہ جس قوم کی جانب اللہ تعالیٰ رسول کو مبعوث فرماتا تھا اس پر آخری اور بڑے عذاب سے قبل چھوٹے چھوٹے عذاب لوگوں کو جھنجوڑنے کی غرض سے نازل فرماتا تھا' تاکہ جو جاگ سکتے ہوں جاگ جائیں اور جن میں اصلاح پذیری کا مادہ موجود ہو وہ اپنی اصلاح کر لیں۔ چنانچہ اسی سنتِ الٰہی کا ذکر ہے اختصار کے ساتھ سورۃ السجدۃ کی آیت ۲۱ میں:

﴿وَلَنُذِيْقَنَّهُمْ مِّنَ الْعَذَابِ الْاَدْنٰى دُوْنَ الْعَذَابِ الْاَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿٢١﴾﴾

''اور ہم انہیں لازماً مزہ چکھائیں گے چھوٹے عذاب کا بڑے عذاب سے قبل' شاید کہ یہ رجوع کر لیں۔''

اور اسی کا تفصیلاً ذکر ہے سورۃ الانعام کی آیات ۴۱ تا ۴۵ اور سورۃ الاعراف کی آیات ۹۴ تا ۹۶ میں!

(۴) قوموں اور اُمتوں پر بحیثیت اجتماعی اس دنیا ہی میں نازل ہونے والے عذابِ الٰہی کی دوسری قسم وہ ہے جو رسولوں کی اُمتوں پر ان کی غلط روی اور بداعمالی کے باعث نازل ہوتا ہے۔ یہ عذاب مقدم الذکر عذابِ استیصال سے اس اعتبار سے تو ہلکا ہوتا ہے کہ اس کے ذریعے قوموں یا اُمتوں کا بالکل خاتمہ نہیں ہوتا' لیکن اس اعتبار سے زیادہ تکلیف دہ ہوتا ہے کہ یہ وقفہ وقفہ سے مسلسل آتا رہتا ہے۔ اور جب کوئی مسلمان اُمت اس نوع کے عذاب میں مبتلا ہوتی ہے تو اس پر جو کیفیت طاری ہو جاتی ہے اسے منفی طور پر بیان

کیا جائے تو وہ اس جہنمی انسان کی سی ہوتی ہے جو قرآن کے الفاظ میں ﴿ثُمَّ لَا یَمُوْتُ فِیْهَا وَلَا یَحْیٰی ⑬﴾ (الاعلیٰ) کا مصداق ہو جاتا ہے یعنی ''نہ وہ زندہ ہی رہتا ہے' نہ اسے موت آتی ہے۔'' اور اگر اسے مثبت طور پر بیان کیا جائے تو یوں کہا جا سکتا ہے کہ ع

''زندگی نام ہے مر مر کے جئے جانے کا!''

اس قسم کے عذاب کا اصل سبب یہ ہوتا ہے کہ جو قوم کسی رسول اور خاص طور پر کسی صاحبِ کتاب و شریعت رسول کی اُمت ہونے کی مدعی ہوتی ہے وہ گویا زمین پر اللہ کی نمائندہ ہونے کی دعوے دار ہوتی ہے۔ اب اگر اس کا طرزِ عمل اور رویہ اس کے دعویٰ کے برعکس ہو' اور وہ اپنے انفرادی اخلاق و اعمال اور سیرت و کردار اور اپنی اجتماعی تہذیب و ثقافت اور معاشی و سیاسی نظام میں کتابِ الٰہی کی تعلیمات اور شریعت خداوندی کے احکام سے مختلف ہی نہیں متضاد نقشہ پیش کرے تو یہ جرم ناقابل معافی ہے' اس لیے کہ اپنے اس طرزِ عمل کے باعث یہ نام نہاد مسلمان اُمت بجائے اس کے کہ خلق اور خالق کے مابین واسطہ (اُمت وسط) اور رابطے کا ذریعہ بنے' الٹی حجاب اور رکاوٹ بن جاتی ہے' اور اس کو دیکھ کر اللہ کے بندے اللہ کے دین کی جانب راغب ہونے کی بجائے الٹے اس سے متنفر ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سورۃ الصّف کی آیات ۲' ۳ میں فرمایا گیا:

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ② كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ③﴾

''اے ایمان کے دعوے دارو! کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں؟ تمہارا یہ طرزِ عمل کہ جو زبان سے دعویٰ کرو اس پر عمل میں پورے نہ اُترو' اللہ کے غضب کو بہت بھڑکانے والا ہے!''

اس نوع کے اجتماعی عذاب میں مبتلا ہونے والی اقوام یا اُمتوں کا ایک وصف مشترک' جسے قسمت کی ستم ظریفی ہی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے' یہ ہے کہ وہ اس زُعم میں مبتلا ہو جاتی ہیں کہ ہم تو اللہ کے بہت چہیتے اور لاڈلے ہیں' اور ہمارا معاملہ دوسرے عام لوگوں کا سا نہیں ہے' بلکہ

ہم اللہ کے یہاں خصوصی اور ترجیحی سلوک کے مستحق ہیں۔اور ستم بالائے ستم یہ کہ اس جہل مرکب میں مبتلا قوم پر جیسے جیسے عذابِ الٰہی کے کوڑوں کی شدت بڑھتی جاتی ہے اس کے متذکرہ بالا زعم میں بھی اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے‘ گویا صورت یہ بن جاتی ہے کہ اِدھر دُرّے پر دُرّہ پڑتا جاتا ہے اور اُدھر غرہ پر غرہ بڑھتا چلا جاتا ہے۔ چنانچہ اس کی کلاسیکل مثال ہے سابقہ اُمت مسلمہ یعنی یہود اور نصاریٰ کا یہ قول جو سورۃ المائدۃ کی آیت ۱۸ میں نقل ہوا ہے کہ:

﴿نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ ؕ﴾

’’ہم تو اللہ کے بیٹے ہیں‘ اور اس کے نہایت چہیتے اور لاڈلے۔‘‘

جس پر اللہ تعالیٰ نے نہایت عبرت انگیز تبصرہ فرمایا:

﴿قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوْبِكُمْ ؕ بَلْ اَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ ؕ﴾

’’(اے نبی ﷺ)! ان سے کہیے کہ پھر اللہ تم پر تمہارے گناہوں کی پاداش میں عذاب کیوں نازل فرماتا رہا ہے؟ بلکہ (اپنے اس زعم کے برعکس) تم بھی ویسے ہی انسان ہو جیسے دوسرے جو اللہ نے پیدا فرمائے!‘‘

اسی طرح ان کا ایک مزعومہ عقیدہ یہ بھی تھا کہ:

﴿لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً ؕ﴾ (البقرة: ۸۰)

’’ہمیں تو (جہنم کی) آگ چھو ہی نہیں سکتی سوائے گنتی کے چند دنوں کے۔‘‘

جس پر نہایت فصیح و بلیغ تبصرہ وارد ہوا:

﴿قُلْ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا فَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗٓ اَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝۸۰﴾ (البقرة)

’’(اے نبی ﷺ! ان سے پوچھیے) کیا تم نے اللہ سے کوئی عہد لے رکھا ہے (جس کے بارے میں تمہیں وثوق ہے) کہ اللہ ہرگز اپنے اس عہد کی خلاف ورزی نہیں کرے گا؟ یا تم بغیر کسی علم کے اللہ کی جانب (غلط باتیں) منسوب کر رہے ہو؟‘‘

اس نوع کے اجتماعی عذاب کے بارے میں یہ قاعدۂ کلیہ بھی بہت اہمیت کا حامل ہے کہ ع ''جن کے رُتبے ہیں سوا' ان کی سوا مشکل ہے!'' کے مطابق کسی اُمت کو جس قدر بلند درجۂ فضیلت حاصل ہوتا ہے اس کے غلط طرزِ عمل پر عذاب کی شدت بھی اتنی ہی زیادہ ہوتی ہے۔ چنانچہ اس کی بھی نہایت نمایاں مثال قرآن حکیم میں سابقہ اُمت مسلمہ یعنی یہود ہی کے ضمن میں وارد ہوئی ہے' یعنی ان پر عذابِ الٰہی کی شدت کے بیان کے لیے جو الفاظ سورۃ البقرۃ کی آیت ۶۱ میں وارد ہوئے ہیں کہ:

﴿ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ ۚ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ۗ﴾

''ان پر ذلت اور مسکنت مسلط کر دی گئی اور وہ اللہ کے غضب میں گھر گئے۔''

ان سے کچھ ہی قبل یہ آیت مبارکہ بھی وارد ہوئی ہے کہ:

﴿يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿٤٧﴾﴾ (البقرۃ)

''اے بنی اسرائیل! ذرا یاد کرو میرے ان انعامات واحسانات کو جو میں نے تم پر کیے' اور میں نے تو تمہیں تمام جہان والوں پر فضیلت عطا فرما دی تھی۔''

پھر یہی معاملہ کسی مسلمان اُمت کے مختلف طبقات کا ہے کہ ان میں سے جسے جتنی زیادہ فضیلت حاصل ہوتی ہے اتنی ہی زیادہ اس کی ذمہ داری بھی ہوتی ہے' اور غیر ذمہ دارانہ طرزِ عمل کے نتیجے میں اتنی ہی سخت سزا بھی اسے ملتی ہے۔

(۵) مندرجہ بالا مباحث سے یہ نتیجہ از خود برآمد ہو جاتا ہے کہ جو قوم نہ کسی رسول کی اُمت ہونے کی مدعی ہو نہ ہی اس کی جانب اس کی یادداشت اور معلوم ومحفوظ تاریخ کی حد تک کوئی رسول مبعوث ہوا ہو اس کے عذاب وثواب اور جزا وسزا کا سارا معاملہ آخرت سے متعلق ہے۔ حیاتِ دُنیوی کی حد تک وہ حیوانات اور چرند و پرند کے مانند اور سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۲۰ ﴿كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ ۭ﴾ اور سورۃ الاحقاف کی آیت ۲۰ ﴿اَذْهَبْتُمْ طَيِّبٰتِكُمْ فِيْ حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا وَاسْتَمْتَعْتُمْ بِهَا ۚ﴾ کے مطابق

اللہ کی عطا اور جود وسخا کے دسترخوان سے کھا پی سکتے ہیں' اور دنیا کی نعمتوں اور لذتوں سے متمتع ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ دنیا کی حد تک تو ان پر صرف سپنگلر کے فلسفۂ تاریخ کے مطابق اس قانونِ طبعی ہی کا اطلاق ہوگا کہ جیسے ہر فرد پیدا ہوتا ہے' پھر جوان ہوتا ہے' پھر بوڑھا ہو جاتا ہے اور پھر مر جاتا ہے' ایسے ہی قومیں اور تہذیبیں بھی مختلف طبعی اَدوار سے گزر کر بالآخر ختم ہو جاتی ہیں۔ رہا حیاتِ اُخروی اور یومِ قیامت کے محاسبہ کا معاملہ تو وہ تو ہر فردِ نوعِ بشر کا اپنے اپنے نظریات وعقائد اور اخلاق واعمال کے اعتبار سے طے ہونا ہی ہے۔

(۲۰/اپریل ۱۹۹۳ء)

باب سوم

سابقہ اور موجودہ مسلمان اُمتیں، اور
سابقہ اُمت کی دو ہزار سالہ تاریخ
کے چار اَدوار

قرآنِ حکیم میں ناموں کی صراحت کے ساتھ تو صرف پچیس انبیاء اور رسولوں علیہم السلام کا ذکر کیا گیا ہے، البتہ بعض نبیوں کا تذکرہ بغیر نام لیے بھی وارد ہوا ہے۔ مزید برآں یہ اصولی بات بھی دو مقامات پر بیان ہوئی ہے کہ ایسے بھی بہت سے رسول دنیا میں گزرے ہیں جن کا ذکر قرآن میں نہیں کیا گیا۔ (جیسے مثلاً سورۃ النساء کی آیت ۱۶۴ اور سورۂ غافر کی آیت ۷۸ میں)۔ پھر یہ اصول بھی دو ہی مرتبہ ذرا سے لفظی فرق کے ساتھ بیان ہوا ہے کہ: ﴿لِكُلِّ قَوۡمٍ هَادٍ ⑦﴾ (الرعد) ''ہر قوم کے لیے ہادی (بھیجا گیا) ہے''۔ اور: ﴿اِنۡ مِّنۡ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيۡهَا نَذِيۡرٌ ⑳﴾ (فاطر) ''کوئی اُمت ایسی نہیں گزری جس میں کوئی خبردار کرنے والا نہ آیا ہو''۔ چنانچہ بعض روایات کے مطابق انبیاء علیہم السلام کی تعداد اتنی ہی رہی ہے جتنے مسلمان حجۃ الوداع کے موقع پر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے، یعنی ایک لاکھ چوبیس ہزار کے لگ بھگ، اور رسولوں کی کُل تعداد اتنی تھی جتنی تعداد میں جان نثار صحابہ رضی اللہ عنہم غزوۂ بدر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم رکاب تھے، یعنی تین سو تیرہ۔ واللہ اعلم!

اس سے قطع نظر کہ دنیا میں جو رسول مبعوث ہوئے ان کی کُل تعداد کتنی ہے، اس امر پر تقریباً اجماع ہے کہ ان میں سے پانچ سورۃ الاحقاف کی آیت ۳۵ میں واردشدہ اصطلاح کے مطابق ''اولوالعزم'' ہیں۔ یعنی حضرت نوحؑ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰ

علیہم الصلوٰۃ والسلام اور سید المرسلین حضرت محمد ﷺ۔ چنانچہ ان ہی کا تذکرہ سورۃ الشوریٰ کی آیت ۱۳ میں وارد ہوا ہے۔ پھر ان میں سے بھی صرف دو ہیں جنہیں کتاب اور شریعت سے نوازا گیا‘ یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام اور نبی اکرم ﷺ۔ اس لیے کہ حضرت نوح علیہ السلام کے ضمن میں تو کسی صحیفے کا ذکر تک کہیں موجود نہیں ہے۔ ’’صحفِ ابراہیمؑ‘‘ کا ذکر اگرچہ قرآن میں ہے (سورۃ النجم‘ آیت ۳۷ اور سورۃ الاعلیٰ‘ آیت ۱۹)‘ لیکن غالباً انہیں ’’کتاب‘‘ اس لیے نہیں قرار دیا گیا کہ ان میں کوئی شریعت درج نہیں تھی۔ (راقم کو بعض لوگوں کے اس خیال سے اتفاق ہے کہ ہندوؤں کے ویدوں اور اپنشدوں میں سے بعض صحف ابراہیمؑ کی بگڑی ہوئی اور تحریف شدہ صورتیں ہیں‘ تاہم ان میں بھی اگرچہ توحید کا بیان تو بلندترین سطح پر بھی موجود ہے‘ لیکن احکام اور شریعت کا کوئی وجود نہیں ہے!) اسی طرح زبور اور انجیل کو بھی اگرچہ عرفِ عام میں کتابیں کہہ دیا جاتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ مستقل بالذّات کتابیں نہیں تھیں‘ بلکہ تورات ہی کے ضمیموں کی حیثیت رکھتی تھیں۔ چنانچہ زبور صرف حمد اور مناجاتِ باری تعالیٰ کے ترانوں پر مشتمل ہے اور انجیل صرف حکمت اور موعظت پر! یہی وجہ ہے کہ سورۃ الزخرف کی آیت ۶۳ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ ﴿قَدۡ جِئۡتُكُمۡ بِالۡحِكۡمَةِ﴾ ’’میں تمہارے پاس حکمت لے کر آیا ہوں‘‘۔ گویا وہ آسمانی کتابیں جن کے ذریعے نوعِ انسانی کو شریعت خداوندی عطا ہوئی‘ دو ہی ہیں‘ یعنی اوّلاً تورات جو بنی اسرائیل کے لیے ہدایت قرار دی گئی (بنی اسرائیل: ۲ والسجدۃ: ۲۳) اور ثانیاً قرآن حکیم جو پوری نوعِ انسانی کے لیے صرف ہدایت ہی نہیں ’’الہدیٰ‘‘ قرار پایا۔

چنانچہ صاحب کتاب وشریعت مسلمان اُمتیں بھی پوری تاریخ انسانی کے دوران دو ہی ہوئی ہیں: ایک سابقہ اُمتِ مسلمہ یعنی بنی اسرائیل اور دوسری موجودہ اُمت مسلمہ یعنی اُمت محمد علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام۔ اور چونکہ اِس وقت دنیا کے حالات تیزی کے ساتھ جو رُخ اختیار کر رہے ہیں اور مستقبل میں جو حوادث و واقعات پیش آنے والے ہیں ان کے ضمن میں ان دونوں اُمتوں کی باہمی آویزش اور اِن کے آخری انجام کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے اس قانونِ عذاب کو فیصلہ کن عامل کی حیثیت حاصل ہے جس پر اس سے قبل

مفصل گفتگو ہو چکی ہے' لہٰذا ان دونوں کے بعض مشترک اور بعض ما بہ الامتیاز خصائص کے علاوہ ان کے ماضی اور حال کا مختصر جائزہ ضروری ہے' تاکہ مستقبل کے بارے میں جو اشارات قرآن حکیم میں وارد ہوئے ہیں اور جو تفصیلی پیشین گوئیاں احادیث نبویہ (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) میں بیان ہوئی ہیں ان کو صحیح پس منظر میں سمجھا جا سکے۔ اور اس طرح ایک جانب حدیثِ نبویؐ اور جناب صادق و مصدوق ﷺ کی پیشین گوئیوں کی عظمت اور حقانیت پر دل مطمئن ہو جائیں' اور دوسری جانب پیش آنے والے حوادث و واقعات پر ذہن کا ردِّعمل تحیر اور استعجاب کا نہ ہو' بلکہ وہ ہو جو سرمد کے اس مصرعے میں بیان ہوا کہ :ع ''بیا بیا من ترا خوب می شناسم!'' یعنی آؤ کہ میں تمہیں خوب پہچانتا ہوں!

بنی اسرائیل کی تاریخ کا آغاز اگرچہ ویسے تو لگ بھگ ۱۸۰۰ قبل مسیحؑ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پوتے حضرت یعقوب علیہ السلام کے زمانے سے ہوتا ہے' اس لیے کہ انہی کا لقب ''اسرائیل'' یعنی ''اللہ کا بندہ'' تھا اور بنی اسرائیل ان ہی کی اولاد ہیں' لیکن ان کو اُمتِ مسلمہ کی حیثیت تقریباً ۱۳۵۰ ق م میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں حاصل ہوئی جب انہیں تورات عطا ہوئی اور ان سے کتابِ الٰہی کو مضبوطی سے تھامنے اور شریعت خداوندی پر کاربند رہنے کا وہ پختہ عہد و میثاق لیا گیا جس کا ذکر قرآن مجید میں بار بار بہت شدّ و مد سے آتا ہے۔ بہرحال اُس وقت سے لے کر ساتویں صدی عیسوی کے آغاز تک جب خاتم النبیین اور سید المرسلین محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی بعثت ہوئی' گویا لگ بھگ دو ہزار برس تک بنی اسرائیل ہی کو اس دنیا میں کتابِ الٰہی کی امین اور شریعت خداوندی کی حامل اُمتِ مسلمہ کی حیثیت حاصل رہی۔ تا آنکہ ۶۲۴ء میں تحویل قبلہ کو بنی اسرائیل کی معزولی اور نئی اُمت یعنی اُمت محمد ﷺ کے اس منصب پر فائز کیے جانے کی علامت بنا دیا گیا۔ چنانچہ اس کے بعد سے تا قیامِ قیامت اُمت محمد ﷺ ہی کتاب و شریعت کی حامل و امین اور روئے ارضی پر اللہ کی نمائندگی کی ذمہ دار ہے۔ کتابِ الٰہی کے امین اور شریعت خداوندی کے حامل ہونا بجائے خود

''یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں!''

کے مصداق ایک بہت بڑا درجۂ فضیلت ہے' جو اِن دونوں اُمتوں کے مابین قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتا ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں دو بار یہ آیت مبارکہ سابقہ اُمتِ مسلمہ کے ضمن میں وارد ہوئی:

﴿یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اذْکُرُوْا نِعْمَتِیَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتُ عَلَیْکُمْ وَاَنِّیْ فَضَّلْتُکُمْ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ ○﴾ (البقرة:٤٧ و ١٢٢)

''اے بنی اسرائیل! یاد کرو میرے اس انعام کو جو میں نے تم پر کیا' اور میں نے تو تمہیں تمام جہانوں (یعنی تمام جہان والوں) پر فضیلت دے دی تھی!''

لیکن اُمت محمد علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کو ایک مزید درجۂ فضیلت اس بنا پر حاصل ہے کہ چونکہ نبی اکرم ﷺ پر نبوت و رسالت اپنے نقطۂ عروج اور درجۂ کمال کو پہنچ کر ختم ہوگئیں اور آپ ﷺ کی بعثت تمام سابق انبیاء ورُسلؑ کے مانند صرف اپنی اپنی قوموں کی جانب نہیں' بلکہ پوری نوعِ انسانی کی جانب ہوئی' جیسے کہ فرمایا سورۂ سبا کی آیت ۲۸ میں کہ: ﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا کَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّ نَذِیْرًا﴾ ''اور ہم نے نہیں بھیجا آپ کو مگر تمام انسانوں کے لیے بشیر اور نذیر بنا کر!'' لہٰذا آپ ﷺ کی اُمت گویا اجتماعی طور پر تا قیامِ قیامت فریضۂ رسالت کی امین بھی ہے۔ یعنی اس کی ذمہ داری سابقہ اُمت مسلمہ کی طرح صرف یہی نہیں ہے کہ خود کتابِ الٰہی کو مضبوطی سے تھامے رہے اور شریعت خداوندی پر سختی سے کاربند رہے' بلکہ یہ بھی ہے کہ پوری نوعِ انسانی تک رسالت محمدی (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کے پیغام کو پہنچانے کا حق ادا کرے اور پورے کرۂ ارضی پر اللہ کے دین کے غلبے یعنی عالمی سطح پر حکومت الٰہیہ یا خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کے نظام کے قیام کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دے۔ اس لیے کہ یہی از روئے قرآن نبی اکرم ﷺ کا مقصدِ بعثت ہے۔ جیسے کہ قرآن حکیم میں تین بار فرمایا گیا:

﴿هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّهٖ﴾

(التوبة: ٣٣' الفتح: ٢٨' الصّف: ٩)

''وہی ہے (اللہ) جس نے بھیجا اپنے رسول (محمد ﷺ) کو الہدیٰ (قرآن حکیم)

اور دین حق (اسلام) دے کر تا کہ غالب کریں اسے (دین حق کو) پورے کے
پورے دین (نظامِ زندگی) پر۔''

یہی وجہ ہے کہ اُمت محمد ﷺ کو ''اُمت وسط'' بھی قرار دیا گیا جس کا فرض پوری نوعِ انسانی پر اللہ اور رسول ﷺ کی جانب سے شہادت یعنی اتمامِ حجت کا فریضہ ادا کرنا ہے[۱] اور ''خیر اُمت''، یعنی بہترین اُمت کا خطاب بھی دیا گیا ''جو پوری نوعِ انسانی کے لیے برپا کی گئی ہے''۔[۲] بقول علامہ اقبال:

ہم تو جیتے ہیں کہ دنیا میں ترا نام رہے
کہیں ممکن ہے کہ ساقی نہ رہے جام رہے!

درجۂ فضیلت کے اس فرق و امتیاز کے ساتھ ساتھ سابقہ اور موجودہ مسلمان اُمتوں کے مابین ایک اور فرق و تفاوت یہ ہے کہ جہاں سابقہ اُمت مسلمہ ایک ''یک نسلی اُمت'' تھی وہاں چونکہ آنحضور ﷺ کی بعثت پوری نوعِ انسانی کی جانب ہے' لہٰذا موجودہ اُمت مسلمہ ہمہ نسلی اور ہمہ قومی (multinational) اُمت ہے۔ مزید برآں درجۂ فضیلت کے اعتبار سے خود یہ بھی دو حصوں میں منقسم ہے' جن کا صراحت کے ساتھ ذکر سورۃ الجمعہ میں کر دیا گیا ہے: ایک ''اُمیین''، یعنی بنی اسمٰعیلؑ اور ان کے تابع اہل عرب اور دوسرے ''آخرین''، یعنی ان کے سوا تمام نسلوں اور جملہ اقوامِ عالم میں سے ایمان لانے والے مسلمان! اور ان میں سے مقدم الذکر کو اِن دو اسباب کی بنا پر بہت بڑا درجۂ فضیلت حاصل ہے کہ (ا) خود نبی اکرم ﷺ ان ہی میں سے تھے۔ جیسے کہ فرمایا سورۃ الجمعہ کی دوسری آیت میں:

---

(۱) ﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ا﴾ (البقرۃ: ۱۴۳) ''اور اسی طرح ہم نے تمہیں ایک درمیانی امت (بہترین اُمت) بنایا' تاکہ تم گواہ ہو جاؤ لوگوں پر' اور رسول گواہ ہو جائیں تم پر۔''

(۲) ﴿كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ط﴾ (آل عمران: ۱۱۰) ''تم وہ بہترین اُمت ہو جسے نوعِ انسانی کے لیے برپا کیا گیا ہے' تم نیکی کا حکم دیتے ہو' بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر پختہ ایمان رکھتے ہو۔''

﴿هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ﴾

''وہی ہے (اللہ) جس نے اٹھایا امیین میں ایک رسول (محمد ﷺ) ان ہی میں سے!''

چنانچہ یہ تو ع ''یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا!'' کے مصداق وہ فضیلت ہے جس پر اہل عرب جتنا ناز کریں کم ہے! اور (۲) یہ کہ اللہ نے ان ہی کی زبان میں اپنا آخری کلام اور نوعِ انسانی کے نام اپنا آخری پیغام نازل فرمایا' جس کا فہم ان کے لیے نہایت آسان ہے۔ بقول علامہ اقبال:

نوعِ انساں را پیامِ آخریں حامل اُو رحمتٌ للعالمیں!

یہ پوری بحث اس اعتبار سے تو یقیناً بڑی خوش آئند بھی ہے اور دل پسند بھی کہ ہمیں بحیثیت اُمت محمد ﷺ سابقہ اُمت مسلمہ پر بڑی فضیلت حاصل ہے۔ لیکن ایک دوسرے پہلو سے اس کا ایک منطقی نتیجہ نہایت تلخ ہے' یعنی اوّلاً ع ''جن کے رتبے ہیں سوا' اُن کی سوا مشکل ہے!'' کے عام اور معقول اصول کے مطابق اور ثانیاً خود قرآن حکیم کی اس نص کی رو سے جو سورۃ الاحزاب میں نبی اکرم ﷺ کی ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن سے خطاب کے ضمن میں وارد ہوئی ہے' یعنی: ﴿یٰنِسَآءَ النَّبِیِّ لَسْتُنَّ کَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ﴾ (آیت ۳۲) ''اے نبی کی گھر والیو! تم عام عورتوں کے مانند نہیں ہو'' اور ﴿مَنْ یَّاْتِ مِنْکُنَّ بِفَاحِشَۃٍ مُّبَیِّنَۃٍ یُّضٰعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَیْنِ ط﴾ (آیت ۳۰) ''اگر تم میں سے کسی نے کسی صریح بے حیائی کا ارتکاب کیا تو اسے (دوسروں کے مقابلے میں) دگنا عذاب دیا جائے گا''۔ یہ ناقابل تردید نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ کسی جرم کی جو سزا بنی اسرائیل کو دی گئی اسی جرم کا ارتکاب موجودہ اُمت مسلمہ کرے گی تو اس کے مقابلے میں دوہرے تہرے ہی نہیں بیسیوں گنا عذاب کی مستحق ہوگی۔ اور خود اُمتِ مسلمہ میں سے سورۃ النور میں واردشدہ الفاظ ﴿وَالَّذِیْ تَوَلّٰی کِبْرَہٗ مِنْهُمْ﴾ (آیت ۱۱) ''اور وہ جو والی ہوا اُس کے سب سے بڑے حصے کا'' کے مطابق اس عذاب کی شدید ترین صورت کے مستحق مسلمانانِ عالم عرب ہوں گے!

مندرجہ بالا اصولی نتائج کو ذہن میں جاگزیں کرنے کے بعد اب آیئے کہ پہلے ہم

سابقہ اُمتِ مسلمہ یعنی بنی اسرائیل کی تاریخ کے بعثت نبوی (ﷺ) تک کے دَور پر ایک نظر ڈال لیں۔

بنی اسرائیل کی تاریخ کے اس دو ہزار سالہ دَور کا وہ خلاصہ جو نئی اُمت مسلمہ یعنی اُمت محمد علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی سبق آموزی اور عبرت پذیری کے لیے کافی تھا' کمالِ فصاحت اور غایت اختصار کے ساتھ قرآن حکیم میں سورۂ بنی اسرائیل کے پہلے رکوع کی چھ (۲ تا ۷) اور آخری رکوع کی چار (۱۰۱ تا ۱۰۴) یعنی کُل دس آیات میں بیان کر دیا گیا ہے' جس کا لبّ لباب یہ ہے کہ قرآن حکیم کے نزول کے زمانے تک بنی اسرائیل پر چار دَور گزر چکے تھے: دو دَور عروج کے' جن کے دوران ان کا طرزِ عمل بھی دینی و اخلاقی اعتبار سے درست رہا اور انہیں دنیا میں عزت و سربلندی بھی حاصل رہی اور وہ کثرتِ اموال و اولاد کی صورت میں اللہ تعالیٰ کے انعامات سے بھی بہرہ ور ہوتے رہے —— اور دو ہی دَورِ زوال کے جن کے دوران انہوں نے نفس پرستی اور بغاوت کی روش اختیار کی' جس کے نتیجے میں ان پر اللہ کا غضب نازل ہوا اور غیر اقوام کے ہاتھوں وہ خود بھی ذلیل و خوار اور مفتوح و مغلوب ہوئے' اور ان کے دینی و روحانی مرکز یعنی ہیکلِ سلیمانی کی حرمت بھی پامال ہوئی۔ تاہم اگر اس کی کسی قدر وضاحت تاریخی اور زمانی ترتیب کے ساتھ کی جائے تو وہ حسب ذیل ہے:

۱) ان کے پہلے دورِ عروج کا آغاز حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خلیفۂ اوّل حضرت یوشع بن نون کی قیادت میں فلسطین کی فتح سے ہوا' اور تقریباً تین سو سال تک نشیب و فراز کے مراحل طے کرتا ہوا یہ دورِ سعادت حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام کے عہدِ حکومت میں اپنے نقطۂ عروج کو پہنچا' جو تاریخ بنی اسرائیل کے عہدِ زریں کی حیثیت رکھتا ہے۔

۲) حضرت سلیمان علیہ السلام کے انتقال کے ساتھ ہی ان کے پہلے دورِ زوال کا آغاز ہو گیا' اس لیے کہ فوراً ہی ان کی سلطنت دو حصوں میں منقسم ہو گئی۔ بہرحال تقریباً تین سو سال ہی میں یہ عہدِ زوال بھی اپنی انتہا کو پہنچ گیا۔ چنانچہ اوّلاً شمال سے آشوریوں نے شمالی سلطنت

اسرائیل کوتاخت وتاراج کیا اور بالآخر ۵۸۷ قبل مسیحؑ میں مشرق (عراق) سے آنے والے بخت نصر (Nebukadnezar) کے حملے نے نہ صرف یہ کہ پوری جنوبی سلطنت یہودیہ کوتہس نہس کر کے رکھ دیا بلکہ یروشلم کی اینٹ سے اینٹ بجادی' لاکھوں افراد کوقتل کیا' چھ لاکھ یہودی مردوں' عورتوں اور بچوں کو بھیڑوں اور بکریوں کے گلوں کی طرح ہانکتا ہوا بابل لے گیا —— اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہیکل سلیمانی کوکلیۃً مسمار کردیا' حتیٰ کہ اس کی بنیادیں تک کھود ڈالیں! —— بابل کی لگ بھگ سوسالہ اسیری کا دَور بنی اسرائیل کی ذلت ورسوائی کا شدید ترین زمانہ ہے۔

۳) بنی اسرائیل کے دوسرے دورِعروج کا آغاز بابل کی اسیری سے شہنشاہِ فارس سائرس یا کیخورس یا ذوالقرنین کے ہاتھوں نجات کے بعد حضرت مسیح علیہ السلام سے تقریباً ساڑھے چار سوسال قبل حضرت عزیر علیہ السلام کی تجدیدی واصلاحی مساعی سے ہوا' اور دوسری خوشحالی یا سربلندی کا یہ دَور بھی لگ بھگ تین سوسال جاری رہا' اوراس کا مظہرِاعظم وہ مکابی سلطنت تھی جوتقریباً ۱۷۰ ق م سے ۶۷ ق م تک نہایت دبدبہ اور شان وشوکت کے ساتھ قائم رہی اور جس نے ایک بار پھر حضرت داوٗد اور حضرت سلیمان علیہما السلام کے دَور کی یاد تازہ کردی۔

۴) بنی اسرائیل کا دوسرا دَورِزوال ۶۳ ق م میں رومی فاتح پومپئی کے ہاتھوں یروشلم کی فتح سے شروع ہوا اور تاحال جاری ہے۔اس کے دوران ان کی تاریخ میں دوسری بار ان پر عذابِ الٰہی کے سخت کوڑے برسے۔ چنانچہ ۷۰ء میں رومی جرنیل ٹائیٹس نے دوبارہ یروشلم شہر اور ہیکل سلیمانی کو مسمار کیا اور ایک دن میں ایک لاکھ ۳۳ ہزار یہودیوں کو تہہ تیغ کر ڈالا اور ۶۷ ہزار کو غلام بنالیا۔ اوراس دن سے جو یہودی اثر ورسوخ سرزمین فلسطین سے ختم ہوا تو لگ بھگ انیس سو برس تک انہیں وہاں سر اُٹھانے کا موقع نہ ملا' بلکہ پورے چھ سو برس تو اس سرزمین میں ان کا داخلہ بھی بند رہا۔ رہا ان کا ہیکل مقدس تو وہ آج تک دوبارہ تعمیر نہ ہوسکا۔ بعد میں رومی شہنشاہ ہیڈریان نے یروشلم شہر کو دوبارہ تعمیر کیا تو اس کا نام بھی یروشلم نہیں ''ایلیا'' رکھا۔

(۲۶؍اپریل ۱۹۹۳ء)

باب چہارم

موجودہ اُمت مسلمہ کی چودہ سوسالہ تاریخ کے چار اَدوار

امام ترمذیؒ نے حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ:

((لَيَاْتِيَنَّ عَلٰى اُمَّتِىْ مَا اَتٰى عَلٰى بَنِىْ اِسْرَائِيْلَ حَذْوَ النَّعْلِ بِالنَّعْلِ))

''میری اُمت پر بھی لازماً وہ تمام حالات وارد ہو کر رہیں گے جو بنی اسرائیل پر واقع ہوئے، ہو بہو بالکل ایسے جیسے (ایک جوڑے کی) ایک جوتی دوسری جوتی سے مشابہ ہوتی ہے۔''

اب سے لگ بھگ اٹھارہ برس قبل ان سطور کا راقم مسجد خضراء سمن آباد میں اعتکاف کی حالت میں اُمت مسلمہ کے ماضی، حال اور مستقبل کے بارے میں غور کر رہا تھا کہ اچانک یہ حدیث مبارک ذہن میں بجلی کی طرح کوندگئی اور اس نے بعینہٖ وہ کام کیا جو ایک بہت بڑے خزانے کو کھولنے کے لیے ایک چھوٹی سی کنجی کرتی ہے۔ چنانچہ فوراً اُمت کی چودہ سوسالہ تاریخ کا ایک خاکہ نوشتۂ دیوار کی طرح نگاہوں کے سامنے آ گیا اور یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ سابقہ اُمت مسلمہ یعنی بنی اسرائیل کی دو ہزار سالہ تاریخ کے جن چار اَدوار کا ذکر سورۂ بنی اسرائیل کی ابتدائی چند آیات میں ہوا ہے وہ ایک اعتبار سے

''خوشتر آں باشد کہ سرّ دلبراں
گفتہ آید در حدیث دیگراں!''

کے مصداق خود اُمت محمد علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی چودہ سوسالہ تاریخ کا پیشگی بیان ہے۔

اس سے جہاں اس حدیث مبارکہ کی عظمت کا نقش دل پر قائم ہوا وہاں اس حدیث نبویؐ کی حقانیت بھی مزید منکشف ہوئی جس میں آنحضورﷺ نے قرآن حکیم کے بارے میں فرمایا ہے کہ:

((فِيْهِ نَبَأُ مَا قَبْلَكُمْ وَخَبَرُ مَا بَعْدَكُمْ وَحُكْمُ مَا بَيْنَكُمْ))

''اس میں تم سے پہلے کے لوگوں کے حالات بھی درج ہیں اور تمہارے بعد آنے والوں کے حالات کا ذکر بھی موجود ہے اور تمہارے مابین رونما ہونے والے جملہ نزاعات کا فیصلہ بھی موجود ہے۔'' (ترمذی و بیہقی، عن علیؓ بن ابی طالب)

بہرحال ذیل میں اُمتِ مسلمہ کے عروج و زوال کا ایک اجمالی خاکہ تاریخی ترتیب کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے، تاکہ ایک طرف ''عروج'' کے ضمن میں ملتِ اسلامی کی عظمت و سطوتِ گزشتہ کی ایک جھلک سامنے آئے اور علامہ اقبال کے اس شعر کے مطابق کہ

''کبھی اے نوجواں مسلم تدبر بھی کیا تو نے؟
وہ کیا گردوں تھا تو جس کا ہے اِک ٹوٹا ہوا تارا!''

مسلمان نوجوان کو معلوم ہو کہ ایک وقت وہ بھی تھا جب عرب افواج جبرالٹر (جبل الطارق) سے شمال مشرق کی جانب بڑھتی ہوئی فرانس کے عین قلب تک جا پہنچی تھیں، اور پھر ایک وقت وہ بھی آیا جب ترک افواج پورے مشرقی یورپ کو روندتی ہوئی ویانا کے دروازوں تک جا پہنچی تھیں۔ شاید کہ اسی طرح کچھ نوجوانوں کے دلوں میں ملت اسلامی کی تجدید اور اس کی عظمت و سطوتِ گزشتہ کی بازیافت کا جذبہ پیدا ہو جائے!۔ اور دوسری طرف ''زوال'' کے ضمن میں یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ خدا کا عدل بے لاگ ہے اور اس کا قانون اٹل اور غیر مبدل۔ اس نے جو معاملہ سابقہ اُمتِ مسلمہ یعنی بنی اسرائیل کے ساتھ کیا بعینہٖ وہی ہمارے ساتھ کیا، حتیٰ کہ ہماری اور ان کی تاریخ میں ایک حد درجہ حیرت انگیز مشابہت موجود ہے اس پہلو سے کہ یہود پر بھی اللہ تعالیٰ کے عذاب کے دو دَور آئے اور ہم پر بھی دو ہی دَور آئے۔

اگرچہ اُمت محمد علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی وسعت کی نسبت سے ہمارے نکبت و اِدبار کے یہ دَور بھی یہود کے مقابلے میں بہت طویل رہے' اور جس طرح بنی اسرائیل کی تولیت کے زمانے میں بیت المقدس کے ناموس کا پردہ

''اِسکندر و چنگیز کے ہاتھوں سے جہاں میں
سو بار ہوئی حضرتِ انساں کی قبا چاک!''

کے مصداق دو بار چاک ہوا اسی طرح ہمارے عہد تولیت میں بھی مسجد اقصیٰ کی حرمت دو ہی مرتبہ پامال ہوئی۔

اُمت مسلمہ کے عروج و زوال کے تاریخی خاکے کے ضمن میں دو باتیں پیشگی سمجھ لینی چاہئیں: ایک یہ کہ' جیسے کہ پہلے بھی عرض کیا جا چکا ہے' اپنی ہیئت تشکیلی کے اعتبار سے اُمت محمد علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے دو حصے ہیں۔ پہلا ''اُمیین'' یعنی بنی اسماعیل پر مشتمل ہے اور اسے اس اُمت کے قلب یا مرکز کی حیثیت حاصل ہے' اور دوسرا ''آخرین'' یعنی دیگر اقوام پر مشتمل ہے' خواہ وہ کرد ہوں یا ترک' اہل فارس ہوں یا اہل ہند' افغان ہوں یا مغل' اہل حبش ہوں یا بربر' شرقِ بعید یعنی ملایا اور انڈونیشیا سے تعلق رکھتے ہوں یا مغربِ بعید یعنی مراکو اور موریطانیہ سے۔

دوسرے یہ کہ جغرافیائی اعتبار سے بھی عالم اسلام کو تین حصوں میں منقسم سمجھنا چاہیے' یعنی ایک قلب' دوسرے میمنہ اور تیسرے میسرہ۔ اگر دنیا کے نقشے کو سامنے رکھ کر عالم اسلام پر نگاہ جمائی جائے تو وہ ایک ایسے عقاب کے مانند نظر آئے گا جو اپنے دونوں بازوؤں کو پوری طرح پھیلائے محو پرواز ہو۔ جزیرہ نمائے عرب' عراق' فلسطین' شام اور ایشیائے کوچک جو عالم اسلام کے قلب کی حیثیت رکھتے ہیں' اس عقاب کے جسم کے مانند نظر آئیں گے جن میں سے ایشیائے کوچک کو اس کے سر اور چونچ سے مشابہت ہے اور جزیرہ نمائے عرب کے جنوبی حصے کو اس کے دُم کے پھیلے ہوئے پروں سے۔ اس عقاب کا دایاں بازو (میمنہ) ایران' ترکستان' افغانستان اور برصغیر پاک و ہند سے ہوتا ہوا ملایا اور انڈونیشیا تک

پھیلا ہوا ہے' اور بایاں بازو (میسرہ) پورے شمالی افریقہ کو لپیٹ میں لیتا ہوا سپین تک چلا گیا ہے۔

اب آئیے تاریخی خاکے کی طرف:

سن عیسوی کے حساب سے اُمتِ مسلمہ کی تاریخ کا آغاز ساتویں صدی سے ہوتا ہے' اس لیے کہ آنحضور ﷺ کی ولادت باسعادت ۵۷۱ء میں ہوئی۔ ۶۱۰ء میں آپؐ نے اپنی دعوت کا آغاز فرمایا اور محتاط ترین حساب کے مطابق اپریل ۶۳۲ء میں آپؐ جزیرہ نمائے عرب کی حد تک اسلامی انقلاب کی تکمیل فرما کر ''رفیق اعلیٰ'' سے جا ملے' **فَصَلّی اللّٰہ علیه وبارك وسلّم تسلیمًا کثیرًا**۔ خلفاءِ ثلاثہ یعنی حضراتِ ابوبکر صدیق' عمر فاروق اور عثمان غنی ؓ کے عہدِ خلافت کے دوران ''اُمیین'' ایک ہاتھ میں قرآن اور دوسرے ہاتھ میں تلوار لے کر ایک سیلاب کے مانند جزیرہ نمائے عرب سے نکلے اور انہوں نے ایک ربع صدی سے بھی کم میں ایران و عراق' شام و فلسطین اور مصر کے علاوہ شمالی افریقہ کے بڑے رقبے پر اسلام کا پرچم لہرا دیا۔ حضرت علی ؓ کے عہد خلافت میں تو یہ عمل رُکا رہا' لیکن بنو اُمیہ کے دَور کے آغاز کے ساتھ ہی اس سیلاب نے دوبارہ آگے بڑھنا شروع کر دیا اور تھوڑے ہی عرصے میں ایک طرف مشرق میں ترکستان' افغانستان اور سندھ تک اور دوسری طرف مغرب میں پورے شمالی افریقہ کے علاوہ سپین سمیت مغربی یورپ کا وسیع علاقہ ''اُمیین'' کے زیر نگیں آ گیا اور عالمِ اسلام کی سرحدیں تین براعظموں تک وسیع ہو گئیں۔ یہی وہ زمانہ تھا جب عرب افواج اندلس سے پیش قدمی کرتے ہوئے فرانس کے عین قلب تک جا پہنچی تھیں۔

آٹھویں' نویں اور دسویں صدی عیسوی کا زمانہ عربوں کے عروج کا دَور ہے' جس کے دوران اسلام کی علمبرداری اور عالمِ اسلام کی سیادت دونوں ''اُمیین'' کی دو اہم شاخوں یعنی بنو اُمیہ اور بنو عباس کے پاس رہیں' اور روئے ارضی کے ایک بڑے حصے پر اُن کے دین و مذہب' ان کے تہذیب و تمدن' ان کے علوم و فنون اور اُن کی شان و شوکت کا سکّہ رواں رہا۔

لیکن جیسے جیسے دُنیوی جاہ وجلال میں اضافہ ہوا' جذباتِ دینی اور حرارتِ ایمانی میں کمی آتی چلی گئی اور اس طرح یہ تناور درخت اندر سے کھوکھلا ہوتا چلا گیا۔ اس اندرونی اضمحلال کے اثرات کے ظاہر ہونے میں کچھ مدت ضرور صرف ہوئی' لیکن دسویں صدی عیسوی ہی کے دوران واضح ہو گیا تھا کہ عرب اپنے عالمِ پیری میں قدم رکھ چکے ہیں۔ گیارہویں صدی عیسوی کے دوران ''اُمیین'' کا انحطاط اور زوال اپنی آخری حدوں کو پہنچ گیا اور اس طرح عالم اسلام کے قلب میں قوت کا ایک خلا پیدا ہو گیا۔

خوش قسمتی سے قوت کے دباؤ میں اس کمی کے نتیجے میں عالم اسلام کی شمال مشرقی سرحدوں سے جو قبائل قلب اسلام کی طرف کھنچ کر آئے وہ پہلے ہی سے مسلمان ہو چکے تھے' یعنی کرد اور ترکانِ سلجوقی' جنہوں نے گیارہویں صدی عیسوی کے دوران شام' فلسطین اور مصر میں مضبوطی کے ساتھ قدم جمائے اور اس طرح عالم اسلام کے قلب کی حفاظت اور مدافعت کے لیے کسی قدر تازہ دم قوت فراہم ہو گئی۔

بارہویں اور تیرہویں صدی عیسوی کے دوران میں اُمتِ مسلمہ پر گویا عذابِ خداوندی کے ''وعدہَ اولیٰ'' کا ظہور ہوا اور ہو بہو وہی نقشہ کھنچ گیا جس کا ذکر سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۵ میں تاریخ بنی اسرائیل کے پہلے دورِ عذاب کے ضمن میں آیا ہے۔ چنانچہ پہلے شمال سے صلیبی طوفان کے ریلے آنے شروع ہوئے' اور ۱۰۹۹ء میں نہ صرف یہ کہ مسجد اقصیٰ کے ناموس کا پردہ چاک ہوا' بلکہ بیت المقدس میں وہ قتل عام ہوا جس کا تذکرہ کرتے ہوئے مغربی مؤرخین بھی کانپ جاتے ہیں۔ پورے اٹھاسی برس تک بیت المقدس پر صلیبیوں کا قبضہ رہا۔ اس لیے کہ دولت عباسی تو ''مرنے والی اُمتوں کے عالم پیری'' کا نقشہ پیش کر رہی تھی' گویا ''اُمیین'' میں تو سرے سے دم خم باقی ہی نہ رہا تھا۔ بالآخر ''آخرین'' کے تازہ و گرم خون نے مجاہد کبیر صلاح الدین ایوبی رحمۃ اللہ علیہ کی سرکردگی میں ۱۱۸۷ء میں بیت المقدس کو صلیبیوں کے قبضے سے نجات دلائی اور اس طوفان کا رُخ موڑا —— اور پھر مشرق کی جانب سے آیا فتنۂ تاتار کا وہ طوفانِ عظیم جس نے پہلے افغانستان اور ایران کو پامال کیا اور ہر جگہ

کشتوں کے پشتے لگا دیے اور بالآ خر ۱۲۵۸ء میں بغداد میں وہ تباہی مچائی کہ رہے نام اللہ کا۔ لاکھوں مسلمان تہ تیغ ہوئے' بغداد کی گلیاں خون کی ندیاں بن گئیں اور الف لیلہ کے اس رومانوی شہر کی اینٹ سے اینٹ بج گئی' اور بعینہٖ وہ کیفیت پیدا ہوگئی جو کم وبیش دو ہزار سال قبل بخت نصر کے حملے سے بیت المقدس کی ہوئی تھی۔ نتیجتاً زوالِ ملکِ مستعصم امیر المؤمنین کے ساتھ ہی خلافت عباسی کا ٹمٹما تا ہوا چراغ بالکل گل ہو گیا' اور نہ صرف یہ کہ اُمتِ مسلمہ پر عذابِ خداوندی کا یہ پہلا دَور تکمیل کو پہنچا بلکہ کم ازکم ''اُمیین'' کی حد تک تو وہ وعید بھی پوری ہوگئی جو سورۂ محمد (ﷺ)' آیت ۳۸ میں وارد ہوئی تھی کہ ﴿وَإِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ﴾ ''اور اگر تم پیٹھ موڑ لو گے تو (اللہ) تمہاری جگہ کسی دوسری قوم کو کھڑا کر دے گا!'' چنانچہ وہ عالمِ اسلام کی سیادت وقیادت کے منصب سے معزول کر دیے گئے۔ دو سال بعد یعنی ۱۲۶۰ء میں اس طوفان کا رُخ بھی ''آخرین'' ہی نے پھیرا جس سے کم ازکم اسلام کا مغربی بازو اس کی تاخت وتاراج سے محفوظ رہ گیا۔

بارہویں اور تیرھویں صدی عیسوی کے دوران عالم اسلام کا قلب بعینہٖ وہی نقشہ پیش کر رہا تھا جسے دیکھ کر کبھی حضرت عزیر علیہ السلام کی زبان سے بے اختیار یہ الفاظ نکل گئے تھے کہ ﴿أَنَّى يُحْيِي هَٰذِهِ اللَّهُ بَعْدَ مَوْتِهَا ۖ﴾ (البقرۃ:۲۵۹) ''کیسے زندہ کرے گا اللہ اسے اس کی موت کے بعد!'' لیکن پھر اُمت مسلمہ کے لیے بھی اللہ تعالیٰ کی وہی شان ظاہر ہوئی جس کا ظہور بنی اسرائیل کے حق میں ہوا تھا' صرف اس فرق کے ساتھ کہ چونکہ سابقہ اُمتِ مسلمہ ایک ہی نسل پر مشتمل تھی لہٰذا اس کی نشاۃِ ثانیہ کا یہ عمل بھی لامحالہ اسی نسل کے اندر واقع ہوا' لیکن اُمت محمد علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے معاملے میں یہ مجبوری نہ تھی' لہٰذا یہاں تجدید ملت کا یہ کام ''آخرین'' کی مختلف اقوام سے لے لیا گیا۔ چنانچہ

''ہے عیاں فتنۂ تاتار کے افسانے سے
پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے''

کے مطابق نہ صرف یہ کہ خود انہی ترکانِ چنگیزی کا بڑا حصہ اسلام لے آیا جن کے ہاتھوں

عالم اسلام پر ہولناک تباہی آئی تھی' بلکہ انہی کے قبیل کے وحشی قبائل میں سے دو قبیلوں کو یہ توفیق ارزانی ہوئی کہ وہ حلقہ بگوشِ اسلام ہوئے اور ان میں سے ایک یعنی ترکانِ تیموری نے ہندوستان میں ایک عظیم الشان مسلم سلطنت کی بنیاد رکھ کر عالم اسلام کے دائیں بازو کی توسیع کی' اور دوسرے یعنی ترکانِ عثمانی نے ابتداءً ایشیائے کوچک میں قدم جمائے اور پھر رفتہ رفتہ اس عظیم الشان مسلمان مملکت کی بنیاد رکھی جس نے ایک طرف پورے مشرقی یورپ پر اپنی بالادستی کا سکہ جمایا' یہاں تک کہ ایک موقع پر اٹلی کے دروازوں تک پر دستک دی اور دوسری طرف شمالی افریقہ سمیت پورے عالم اسلام کے قلب کی حفاظت و سیادت کی ذمہ داری سنبھالی' تا آنکہ خلافت کا بھی احیاء کیا اور اس طرح گویا عالم اسلام کے قلب کی عظمت وسطوتِ گزشتہ پھر پوری طرح لوٹ آئی' اگرچہ عربوں کے ذریعے نہیں بلکہ ترکوں کے واسطے سے۔

قسمت کے کھیل بھی عجیب ہیں۔ اِدھر تو خلافتِ عثمانی کے استحکام کے ذریعے عالمِ اسلام کے قلب میں گویا ملت کی نشاۃِ ثانیہ ہوئی اور اُدھر یورپی استعمار کے سیلاب کی صورت میں اُمتِ مسلمہ پر عذابِ الٰہی کے دوسرے اور نہایت طویل دَور کا آغاز ہو گیا' جس کا اصل زور عالمِ اسلام کے میسرہ اور میمنہ کی جانب رہا۔

یہ ایک ناقابل تردید تاریخی حقیقت ہے کہ یورپ میں احیاء العلوم کا پورا عمل اسلام ہی کے زیراثر شروع ہوا' اور یہ مسلمان ہی تھے جنہوں نے یورپ کو مشرق و مغرب کے علوم و فنون سے روشناس کرایا۔ لیکن جیسے ہی یورپ میں بیداری ہوئی اور وہاں قوت کا دباؤ بڑھا' گویا عالم اسلام کی شامت آ گئی۔

یورپ مشرق و مغرب دونوں اطراف سے مسلمانوں کے شکنجے میں جکڑا ہوا تھا' لیکن مشرق میں عذاب کے وعدۂ اولیٰ کے بعد نشاۃِ ثانیہ کا عمل ظاہر ہو چکا تھا اور عظیم سلطنت عثمانیہ عالمِ اسلام کے قلب کے محافظ سنتری کی حیثیت سے کھڑی تھی' البتہ مغرب میں اب دولت ہسپانیہ ''مرنے والی اُمتوں کے عالم پیری'' کا نقشہ پیش کر رہی تھی۔ لہٰذا ع ''ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات'' کے مصداق یورپی استعمار کا اوّلین شکار وہی بنی اور

پندرہویں صدی عیسوی کے دوران اس عظیم سلطنت کا قلع قمع ہو گیا۔ یہاں تک کہ ۱۴۹۲ء میں سقوطِ غرناطہ کے بعد تو بعینہٖ وہ صورت پیدا ہو گئی جس کا نقشہ قرآن مجید میں عذابِ استیصال کا نوالہ بننے والی قوموں کے بیان میں کھینچا جاتا ہے' یعنی: ﴿كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا﴾ (ھود:٦٨ و ٩٥) ''جیسے کہ وہ کبھی وہاں آباد ہی نہ تھے''۔ اور: ﴿لَا يُرٰى اِلَّا مَسٰكِنُهُمْ﴾ (الاحقاف:۲۵) ''اب ان کے ویران مسکنوں کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا!''

۱۴۹۸ء میں واسکوڈی گاما نے نیا بحری راستہ تلاش کیا اور اس کے فوراً بعد یورپی استعمار کا سیلاب عالم اسلام کے میمنہ پر ٹوٹ پڑا اور انڈونیشیا' ملایا اور ہندوستان مختلف یورپی اقوام کے استبدادی پنجوں میں جکڑے گئے' اور یہ عمل جس کا آغاز سولہویں صدی عیسوی سے ہوا' اٹھارہویں اور انیسویں صدی عیسوی میں عالم اسلام کے دائیں بازو کی حد تک اپنے عروج کو پہنچ گیا۔

اسی اثناء میں دولت عثمانی بھی اپنے شباب کے دَور سے گزر آئی تھی اور اب اس نے بھی ''مردِ بیمار'' کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ گویا عالم اسلام کے قلب میں آٹھ صدیوں کے بعد پھر وہی قوت کا خلا پیدا ہو گیا جو گیارہویں صدی عیسوی میں دولتِ عباسیہ کے اضمحلال کے باعث پیدا ہوا تھا' اور قوت کے دباؤ کی اس کمی کے باعث مغربی استعمار کا رُخ عالم اسلام کے قلب کی جانب مڑ گیا۔

عالم اسلام کے قلب پر اللہ تعالیٰ کے عذاب کے اس دوسرے دَور کا آغاز بیسویں صدی کے شروع میں ہو گیا تھا۔ چنانچہ پہلی عالمگیر جنگ کے خاتمے پر جب دنیا کا نیا نقشہ سامنے آیا تو معلوم ہوا کہ عظیم دولت عثمانیہ سمٹ سمٹا کر ایشیائے کوچک میں محدود ہو گئی اور شمالی افریقہ سمیت پورا عالم عرب چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں منقسم ہو کر مختلف یورپی اقوام کے براہِ راست زیر نگیں ہو گیا یا بالواسطہ محکومی میں آ گیا اور ہو بہو وہی کیفیت پیدا ہو گئی جس کی خبر مخبر صادق ﷺ نے ان الفاظ میں دی تھی کہ: ((يُوْشِكُ الْاُمَمُ اَنْ تَدَاعٰى عَلَيْكُمْ كَمَا تَدَاعَى الْاَكَلَةُ اِلٰى قَصْعَتِهَا)) یعنی ''ایک زمانہ آئے گا کہ اقوامِ عالم ایک دوسرے کو تم پر ٹوٹ پڑنے کی اس طرح دعوت دیں گی جیسے (کسی دعوتِ طعام میں) کھانے والے

ایک دوسرے کو دستر خوان کی طرف بلاتے ہیں۔‘‘

اس طرح بحیثیت مجموعی اُمتِ مسلمہ پر اللہ تعالیٰ کے عذاب کا دَورِ ثانی اس صدی کے رُبع اوّل میں اپنے نقطۂ عروج کو پہنچ گیا تھا جب کہ پورا عالم اسلام مغربی استعمار کے ناپاک شکنجے میں جکڑا گیا' اگرچہ خاص ''اُمّیین'' کے حق میں ''وَعْدُ الْاٰخِرَةِ'' کی وہ مکمل صورت جو سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۷ میں بیان ہوئی تھی' تقریباً نصف صدی بعد ۱۹۶۷ء میں ظاہر ہوئی جب اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی ایک مغضوب وملعون قوم کے ہاتھوں ایک شرمناک اور ذلت آمیز شکست دلوائی' اور عربوں کے عہد تولیت کے دوران ایک بار پھر مسجد اقصیٰ کی حرمت پامال ہوئی اور بیت المقدس ان کے ہاتھوں سے نکل کر یہود کے قبضے میں چلا گیا' اور اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ اس بار یہ قبضہ کتنا طویل ہو گا۔ اس داستان کا المناک ترین باب یہ ہے کہ مغربی استعمار نے اُمتِ مسلمہ کی وحدتِ ملّی کو پارہ پارہ کر دیا' اور اس صدی کے آغاز ہی میں نسلی اور علاقائی عصبیتوں کے وہ بیج مسلمان اقوام کے دلوں میں بو دیے جو ابھی تک برگ و بار لا رہے ہیں۔ چنانچہ پہلے انہوں نے عربوں کو ترکوں کے خلاف ابھارا' نتیجتاً عالم اسلام کا قلب دولخت ہو گیا اور وحدتِ ملّی کی علامت یعنی خلافت کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ پھر عالم عرب کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں اس طرح تقسیم کیا کہ نسلی اور لسانی اشتراک کے باوجود عالم عرب کے کامل اتحاد کا امکان تاحال دُور دُور تک نظر نہیں آتا۔

اسی نسلی تعصب کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کے اس عذاب کا مزہ بھی اُمتِ مسلمہ کو چکھنا پڑا جو قرآن مجید میں ان الفاظ میں بیان ہوا ہے کہ ﴿يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَّيُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ ؕ﴾ (الانعام: ۶۵) ''تمہیں (اللہ تعالیٰ) گروہوں میں تقسیم کر دے اور پھر چکھائے ایک کو دوسرے کی جنگی قوت کا مزہ''۔ چنانچہ اس صدی کے آغاز میں عربوں کے ہاتھوں ترکوں کا خون بہا اور پھر ۱۹۷۱ء میں بنگالی مسلمان کے ہاتھوں غیر بنگالی مسلمان کے خون کی ہولی اور جان و مال اور عزت و آبرو کی دھجیاں بکھرنے کا منظر چشم فلک نے دیکھا۔ فَاعْتَبِرُوْا يَا اُولِي الْاَبْصَارِ ۝

(۲۸/اپریل ۱۹۹۳ء)

باب پنجم

بیسویں صدی عیسوی:

سابقہ اور موجودہ مسلمان اُمتیں

بیسویں صدی عیسوی اس اعتبار سے بھی تاریخ میں یادگار رہے گی کہ اس کے اوائل میں عظیم سلطنت عثمانیہ کے پرزے اڑ گئے اور اواخر میں عظیم سوویت یونین کی دھجیاں بکھر گئیں' لیکن ہمارے موضوع کے اعتبار سے اہم تر بات یہ ہے کہ اس کے دوران معزول شدہ اور موجودہ مسلم اُمتوں' یعنی یہودیوں اور مسلمانوں دونوں کے ضمن میں دو بالکل مخالف اور متضاد کیفیات کا عمل دخل بالکل اسی شان کے ساتھ جاری رہا جو سورۃ الرحمٰن کی آیات ۱۹' ۲۰ میں بیان ہوئی ہیں' یعنی: ﴿مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيٰنِ ۝۱۹ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيٰنِ ۝۲۰﴾ ''چلائے دو دریا ایک دوسرے سے متصل' لیکن ان کے مابین ایک پردہ حائل ہے جس کے باعث وہ ایک دوسرے پر غالب نہیں آ سکتے''۔ یعنی ایک جانب ان دونوں پر اللہ کے عذاب کے دورِ ثانی کا وہ سلسلہ نہ صرف جاری رہا بلکہ بعض اعتبارات سے شدید تر ہو گیا جو یہودیوں کے معاملے میں تو لگ بھگ دو ہزار برس سے جاری تھا اور مسلمانوں کے معاملے میں بھی کئی صدیوں سے چلا آ رہا تھا' لیکن دوسری جانب ان دونوں ہی اُمتوں میں ایک احیائی عمل بھی شروع ہوا اور دونوں ہی بعض اعتبارات سے تیزی کے ساتھ ترقی اور عروج کی جانب بڑھتی نظر آ ئیں۔

واضح رہے کہ اس سے قبل اللہ تعالیٰ کے قانونِ عذاب کی جو تفصیل بیان ہو چکی ہے اس کے مطابق یہودی اب سے لگ بھگ دو ہزار برس قبل عذابِ استیصال کے مستحق ہو چکے تھے' اس لیے کہ حضرت مسیح علیہ السلام ان کی جانب رسول کی حیثیت سے مبعوث ہوئے تھے' جیسے

کہ سورۂ آل عمران کی آیت ۴۹ اور سورۃ الصّف کی آیت ۶ میں صراحتاً مذکور ہے' لیکن یہودیوں نے نہ صرف یہ کہ ان کا انکار کیا' بلکہ ان کی والدہ محترمہ حضرت مریم صدیقہ سلامٌ علیہا پر بدکاری کا الزام عائد کیا' اور خود آنجنابؑ کو جادوگری اور ارتداد کے الزامات کے تحت واجب القتل قرار دیا اور اپنے بس پڑتے تو انہیں سولی پر چڑھوا کر ہی دم لیا۔ یہ دوسری بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے معجزانہ طور پر آپؑ کو زندہ آسمان پر اٹھالیا اور (انجیل برنباس کے مطابق) آپؑ کی صورت میں درحقیقت آپؑ کے اُس غدار حواری یہوداہ اسکریوتی کو سولی چڑھوا دیا جس نے سونے کے تیس سکوں کے عوض مخبری کر کے آپؑ کو گرفتار کرایا تھا۔ تاہم ایک خاص حکمت کے تحت (جس کا ذکر بعد میں آئے گا) اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کی اس آخری سزا کی تنفیذ کو مؤخر رکھا۔

سورۂ بنی اسرائیل کے پہلے رکوع کی آیت ۸ سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی بعثت کے موقع پر اللہ نے آپ ﷺ کی رحمۃٌ للعالمینی کے صدقے یہود کو بھی ایک موقع توبہ کا عنایت فرمایا تھا' بفحوائے: ﴿عَسٰی رَبُّكُمْ اَنْ یَّرْحَمَكُمْ ۚ وَاِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا﴾ یعنی ''تمہارا ربّ اب بھی تم پر رحم فرمانے کے لیے آمادہ ہے' لیکن اگر تم نے سابقہ روش برقرار رکھی تو ہم بھی وہی کریں گے جو پہلے کرتے رہے ہیں!'' یہ گویا جدید عدالتی اصطلاح میں ایک رحم کی اپیل کا آخری موقع تھا جو یہودیوں نے اپنی سرکشی کے باعث گنوا دیا' چنانچہ اللہ تعالیٰ نے آخری فیصلہ صادر فرما دیا:

﴿وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكَ لَيَبْعَثَنَّ عَلَيْهِمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ يَّسُوْمُهُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ ؕ﴾ (الاعراف : ۱۶۷)

''اور جب اعلان کر دیا تیرے ربّ نے کہ وہ قیامت کے دن تک ان پر لازماً ایسے لوگوں کو مسلط کرتا رہے گا جو انہیں بدترین عذاب دیتے رہیں گے۔''

اللہ تعالیٰ کے اس فیصلے کا سب سے نمایاں مظہر اس بیسویں صدی کے وسط میں سامنے آیا جب ہٹلر نے نہ صرف جرمنی بلکہ مشرقی یورپ کے تقریباً تمام ممالک کے ساٹھ لاکھ

یہودیوں کو ایسے سپیشل گیس چیمبرز اور ایکسٹرمینیشن پلانٹس کے ذریعے نیست و نابود کیا جن کی نظیر غالباً پوری انسانی تاریخ میں نہیں مل سکتی۔ لیکن دوسری جانب یہ معجزہ بھی اسی بیسویں صدی میں ظاہر ہوا کہ جو ملعون و مغضوب قوم دو ہزار برس سے در بدر بھٹک رہی تھی اور کہیں امان نہیں پا رہی تھی اُسے دوبارہ اپنے خوابوں کی سرزمین یعنی فلسطین میں پاؤں جمانے کا موقع ملا۔ چنانچہ پہلی جنگ عظیم کے دوران انگریزوں نے عربوں سے جو بغاوت ترکوں کے خلاف کرائی تھی، جس کے نتیجے میں نہ صرف یہ کہ عظیم سلطنت عثمانیہ کا خاتمہ ہوا بلکہ مسلمانانِ عالم کی وحدتِ ملی کا نشان یعنی خلافت کا ادارہ بھی ختم ہو گیا' اس کا ''انعام'' انہیں حکومت برطانیہ کی جانب سے ۲ نومبر ۱۹۱۷ء کے ''اعلان بالفور'' کی صورت میں ملا' جس کے نتیجے میں پہلے سرزمین فلسطین میں یہودیوں کی آبادکاری ہوئی اور بالآخر ۱۹۴۸ء میں اسرائیل کا خنجر اُن کے سینے میں پیوست کر دیا گیا۔ گویا کہ یورپی استعمار کی صورت میں موجودہ اُمت مسلمہ پر اللہ کی جو سزا گزشتہ تین صدیوں سے تدریجاً بڑھ رہی تھی اس کے آخری اور شدید ترین دَور کا ''آغاز'' ہو گیا۔ یعنی اُمت مسلمہ کے افضل ترین حصے یعنی عربوں پر اللہ کی ایک مغضوب اور ملعون قوم کے ہاتھوں ذلت آمیز شکستوں کا سلسلہ شروع ہو گیا' جس کی پہلی قسط تو ۱۹۴۸ء ہی میں مل گئی تھی جب انگریزی فوج کے فلسطین سے نکلتے ہی عربوں اور یہودیوں میں جنگ شروع ہو گئی' جس کے نتیجے میں بجائے اس کے کہ یہودیوں کو کوئی نقصان پہنچتا' وہ اس رقبے سے بھی زیادہ پر قابض ہو گئے جو انہیں تقسیم کے فیصلے کے تحت ملا تھا۔

''اُمّیین'' پر اللہ کے عذاب کا دوسرا اور شدید تر کوڑا لگ بھگ بیس برس بعد ۱۹۶۷ء کی چھ روزہ جنگ میں نہایت ذلت آمیز ہی نہیں' حد درجہ شرمناک شکست کی صورت میں پڑا' جس کے نتیجے میں ۱۹۴۸ء میں قائم ہونے والے اسرائیل نے ''عظیم تر اسرائیل'' کی جانب مزید پیش قدمی کر لی اور مصر و شام اور اردن سے اضافی علاقے ہتھیا لیے ——— اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اپنے مذہبی مرکز یروشلم پر بھی قبضہ حاصل کر لیا۔ ''آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا!''

قصہ مختصر، بیسویں صدی عیسوی میں ایک جانب سابقہ اور معزول شدہ اُمت مسلمہ یعنی یہودیوں پر اللہ کے آخری عذابِ استیصال کا ریہرسل یا ٹریلر بھی ''ہالوکاسٹ'' کی صورت میں سامنے آ گیا، اور دوسری طرف ان کے اس آخری عروج کی جانب بھی نمایاں پیش قدمی ہوگئی جس کا کوئی سان گمان بھی ایک صدی قبل نہیں ہوسکتا تھا۔

یہی معاملہ موجودہ اُمت مسلمہ کے ساتھ پیش آیا کہ جہاں ایک جانب اس صدی کے آغاز میں سلطنت عثمانیہ اور خلافت اسلامی کے خاتمے، اور پھر ۱۹۶۷ء میں عربوں کی عبرتناک ہزیمت اور مسجد اقصیٰ کی بے حرمتی اور ۱۹۷۱ء میں ''آخرین'' کے اہم ترین اور عظیم ترین ملک یعنی پاکستان کی شکست و ریخت اور ان ہندوؤں کے ہاتھوں شرمناک ہزیمت کی صورت میں عذابِ الٰہی کے سائے مزید گہرے ہوگئے جن پر مسلمانوں نے سینکڑوں برس حکومت کی تھی، وہاں دوسری جانب یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ اس صدی کے ربع اوّل کے خاتمے کے لگ بھگ جب اُمت کے ایک حساس اور دردمند فرد کے دل کی گہرائیوں سے نکلنے والی یہ دردانگیز صدا ایک تلخ حقیقت کا روپ دھار چکی تھی کہ

پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے
اسلام کا گر کر نہ اُبھرنا دیکھے
مانے نہ کبھی کہ مد ہے ہر جزر کے بعد
دریا کا ہمارے جو اُترنا دیکھے

رحمتِ خداوندی میں جوش آ چکا تھا اور تاریخ بالقوہ ایک کروٹ لے چکی تھی، جس کے نتیجے میں پورے عالم اسلام میں ایک احیائی عمل شروع ہوگیا، جس کا کسی قدر تفصیلی جائزہ بہت ضروری ہے، تاکہ مایوسی کے سائے زیادہ گہرے نہ ہوں اور حالات کے تاریک رُخ کے ساتھ ساتھ روشن پہلو بھی نگاہوں کے سامنے موجود رہے۔

اس احیائی عمل کے بارے میں بعض بنیادی حقائق ذہن نشین رہنے چاہئیں۔ مثلاً ایک یہ کہ یہ کوئی سادہ اور بسیط عمل نہیں ہے، بلکہ اس کے متعدد گوشے ہیں، جن میں سے

ہرایک میں اولوالعزم افراد اور جماعتیں برسرکار ہیں‘ اور جو بظاہر ایک دوسرے سے جدااورمختلف بلکہ بعض پہلوؤں کے اعتبار سے متضاد ہونے کے باوجود اس وسیع تر احیائی عمل کے اعتبار سے ایک دوسرے کے لیے باعث تقویت ہیں۔ دوسرے یہ کہ اسلام کی نشأۃِ ثانیہ اور ملت اسلامی کی تجدید کا یہ کام دس بیس برس میں مکمل ہونے والا نہیں‘ بلکہ سورۃ الانشقاق کی آیت: ﴿لَتَرۡكَبُنَّ طَبَقًا عَنۡ طَبَقٍ ﴿١٩﴾﴾ یعنی ’’تم لازماً چڑھو گے درجہ بدرجہ‘‘ کے مصداق تدریجاً بہت سے مراتب ومراحل سے گزر کر ہی پایۂ تکمیل کو پہنچے گا۔ لہٰذا اس ارتقائی عمل کا ہر درجہ اپنی جگہ اہمیت کا حامل ہے‘ اور چاہے بعد کے مراحل میں پہلوں کا کام بہت حقیر بلکہ کسی قدر غلط بھی نظر آئے‘ اپنے اپنے دَور کے اعتبار سے اس کی اہمیت ووقعت سے بالکلیہ انکار ممکن نہیں۔ تیسرے یہ کہ اس ہمہ گیر تجدیدی جدوجہد میں اگرچہ افراد کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم ہے‘ بقول علامہ اقبال ؎

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر
ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارا

تاہم جماعتوں اور تنظیموں کے مقابلے میں کم تر ہے۔ پھر جماعتیں بھی تحریکوں کی وسعت میں گم ہو جاتی ہیں اور بالآخر تمام تحریکیں بھی اس وسیع احیائی عمل کی پنہائیوں میں گم ہو جاتی ہیں جو ان سب کو محیط ہے۔

اس احیائی عمل کا اوّلین مرحلہ مسلمان اقوام کا مغربی استعمار کے براہِ راست تسلط سے نجات کا حصول تھا جو بحمد اللہ گزشتہ چالیس پچاس سال کے دوران تقریباً مکمل ہو چکا ہے‘ اور اگرچہ اب بھی ہم مغرب کی علمی وفکری اور تہذیبی وثقافتی غلامی میں مبتلا ہیں اور اقوامِ مغرب کی سائنسی وتکنیکی بالادستی کے باعث بہت سے پہلوؤں سے ان کے دست نگر بھی ہیں‘ تاہم خدا کا شکر ہے کہ ایک قضیۂ فلسطین سے قطع نظر اور صرف کشمیر اور اریٹریا کے علاوہ پورے کرۂ ارضی پر مسلم اکثریت کا کوئی علاقہ براہِ راست غلامی ومحکومی کی لعنت میں گرفتار نہیں رہا۔

خالص اصولی ونظریاتی اور تصوریت پسندانہ نقطۂ نظر سے تو ’’مسلمان اقوام‘‘ کی

اصطلاح ہی قطعاً غلط ہے' اس لیے کہ ازروئے قرآن وحدیث مسلمانوں کی حیثیت ایک جماعت یا اُمت یا حزب کی ہے نہ کہ قوم کی' لیکن واقعیت پسندانہ نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں نے ایک جماعت یا اُمت یا حزب کا کردار تو بہت پہلے ترک کر دیا تھا اور بالفعل ایک قوم ہی کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ البتہ وحدتِ ملی کا تصور اس صدی کے آغاز تک برقرار تھا' لیکن اس صدی کے رُبع اوّل کے دوران مغربی استعمار کے ہتھکنڈوں نے اسے بھی ختم کر کے رکھ دیا تھا' اور اِس وقت فی الواقع روئے ارضی پر کوئی ایک اُمت مسلمہ آباد نہیں ہے' بلکہ بہت سی مسلمان اقوام آباد ہیں۔

اسی طرح خالص تصوریت پسندانہ نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو ع ''نشۂ مے کو تعلق نہیں پیمانے سے'' کے مصداق مسلمانوں کی آزادی اور خودمختاری کا احیائے اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے' لیکن واقعیت پسندانہ نگاہ سے دیکھئے تو مستقبل کے بارے میں تو کچھ نہیں کہا جا سکتا' ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے دین کی علمبرداری کی سعادت کسی بالکل ہی نئی قوم کے حوالے فرمادے اور ﴿یَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَیْرَکُمْ﴾ (محمد:۳۸) یعنی ''بدل دے تمہاری جگہ کسی اور قوم کو'' کی شان دوبارہ ظاہر ہو ـــــ لیکن بحالاتِ موجودہ تو ع ''کہیں ممکن ہے کہ ساقی نہ رہے' جام رہے'' کے مصداق اسلام کا مستقبل موجودہ مسلمان اقوام ہی کے ساتھ وابستہ ہے اور دونوں باہم لازم وملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اندریں حالات مسلمان اقوام کا آزادی وخودمختاری کی نعمت سے ہمکنار ہونا یقیناً احیائے اسلام ہی کے سلسلے کی ایک کڑی ہے' اور جن تحریکوں کے ذریعے یہ مشکل مرحلہ سر ہوا ہے ان کی سعی بھی اسلام کی نشأۃِ ثانیہ ہی کی جدوجہد کا جزو قرار پائے گی۔ رہا یہ شبہ کہ ان میں سے اکثر کے قائدین اور زعماء کا دین و مذہب کے ساتھ کوئی واقعی اور عملی تعلق نہ تھا' تو اسی کا جواب ہے نبی اکرم ﷺ کے ان الفاظِ مبارکہ میں کہ ((اِنَّ اللّٰہَ لَیُؤَیِّدُ ھٰذَا الدِّیْنَ بِالرَّجُلِ الْفَاجِرِ)) یعنی ''یقیناً اللہ تعالیٰ اپنے دین کی خدمت غیر متقی انسانوں سے بھی لے لیتا ہے''۔ (بخاری' کتاب الجہاد' عن ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ)

اس ضمن میں ایک اور حقیقت بھی پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ اگرچہ مختلف مسلمان ممالک میں حصولِ آزادی کی تحریکوں کی تقویت کے لیے جن علاقائی یا نسلی عصبیتوں کو استعمال کیا گیا انہیں بھی خاص اصولی اور نظری اعتبار سے اسلام کے نظامِ فکر کے ساتھ سوائے تضاد کے کوئی نسبت حاصل نہیں ہے‘ لیکن عالمِ واقعہ میں اس کے سوا کوئی چارۂ کار موجود نہ تھا‘ اس لیے کہ اسلام کے ساتھ مسلمانوں کا ذہنی وقلبی رشتہ اتنا قوی نہ رہا تھا کہ اسے کسی جاندار اور فعال تحریک کی اساس بنایا جاسکتا۔ اور حصولِ استقلال کے لیے جس مؤثر مزاحمت کی ضرورت ہوتی ہے اس کی بنیاد خیالی یا جذباتی نہیں بلکہ حقیقی اور واقعی اساسات ہی پر رکھی جاسکتی ہے۔ چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ اگر ترک نیشنلزم کا جذبہ فوری طور پر بیدار نہ ہوگیا ہوتا تو شاید آج ترکی کا نام ونشان بھی صفحۂ ارضی پر موجود نہ ہوتا۔ اسی طرح اسلام سے جتنا کچھ حقیقی اور واقعی تعلق اِس وقت مسلمانانِ عرب کو ہے وہ کسے معلوم نہیں! اندریں حالات عرب نیشنلزم ہی یورپی سامراج کے چنگل سے نکلنے کی جدوجہد کے لیے واحد ممکن بنیاد بن سکتا تھا‘ اور ایک وقتی ضرورت اور دفاعی تدبیر کی حد تک اس کے استعمال میں کوئی قباحت بھی نہیں ہے‘ بشرطیکہ اسے نظامِ فکر کی مستقل اساس کے طور پر قبول نہ کرلیا جائے‘ اور حصولِ آزادی کے عبوری مقصد کی تکمیل کے بعد صحیح اسلامی فکر اور وحدتِ ملّی کے شعور واحساس کو اجاگر کیا جائے۔

اس پس منظر میں دیکھئے تو تحریک پاکستان کا معاملہ بالکل منفرد نظر آتا ہے۔ برصغیر کے مسلمان بھی اگر برطانوی استعمار سے نجات حاصل کرنے کے لیے ہندی قومیت کی اساس پر غیر مسلموں کے ساتھ اشتراکِ عمل کرتے تو اس کے لیے بھی وجہ جواز موجود تھی۔ (چنانچہ جمعیت علماء ہند کی سیاسی جدوجہد اسی اصول پر مبنی تھی‘ بلکہ مولانا حسین احمد مدنیؒ نے اپنی خودنوشت سوانح ''نقشِ حیات'' میں تو ثابت کیا ہے کہ خود مجاہد کبیر حضرت سید احمد بریلویؒ مسلمانانِ پنجاب کو ''سکھا شاہی'' سے نجات دلانے کے بعد اسی اساس پر انگریزوں کے خلاف تحریک چلانے کا ارادہ رکھتے تھے!) لیکن یہ اللہ تعالیٰ کا خاص فضل وکرم ہے کہ یہاں کے مخصوص حالات کے باعث مسلمانانِ ہند نے اپنی سیاسی جدوجہد کا آغاز ''مسلم

قومیت'' کی اساس پر کیا' جس کے نتیجے میں وہ ملک وجود میں آیا' جو حضرت سلمان فارسی ؓ کی طرح جو اپنا نام ''سلمان بن اسلام'' بتایا کرتے تھے' صرف اور صرف ''فرزندِ اسلام'' قرار دیا جا سکتا ہے اور جس کے قیام کے لیے کوئی وجہ جواز سوائے اسلام کے موجود نہیں ہے۔ گویا پاکستان ع ''خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی'' (ﷺ) کے مصداق اپنی پیدائش اور ہیئت ترکیبی کے اعتبار سے تمام مسلمان ممالک سے ایک قدم آگے ہے۔

مسلمانانِ ہند کی سیاسی جدوجہد کو اس رُخ پر ڈالنے والے اسباب وعوامل میں سلبی و منفی طور پر سب سے زیادہ دخل ہندوؤں کی روایتی تنگ نظری اور تنگ دلی اور اس سے بھی بڑھ کر مسلمانوں سے اپنی ہزار سالہ شکست کا انتقام لینے کے اس جذبے کو حاصل ہے جو اُن کے سینوں میں کھولتے ہوئے لاوے کی طرح پک رہا تھا۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو گویا ان کا یہ طرزِ عمل بھی اسلام کی نشأۃِ ثانیہ کے لیے ممد ومعاون بن گیا اور ہم اپنے سابق ابنائے وطن کی خدمت میں بجا طور پر عرض کر سکتے ہیں کہ ؎

تو نے اچھا ہی کیا دوست سہارا نہ دیا
مجھ کو لغزش کی ضرورت تھی سنبھلنے کے لیے

مثبت اسباب کے ضمن میں ایک تو یہ حقیقت پیش نظر رہنی چاہیے کہ مسلمانانِ ہند کے دلوں میں پہلے بھی جذبۂ ملی باقی تمام دنیا کے مسلمانوں سے زیادہ تھا' جس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ تنسیخ خلافت پر جس قدر شدید ردّ عمل یہاں ظاہر ہوا اس کا عُشر عشیر بھی کہیں اور نہیں ہوا' حتیٰ کہ ایک وقت تھا کہ برصغیر کے ہندوؤں اور مسلمانوں سب کی مشترک سیاسی جدوجہد کا عنوان ہی ''تحریک خلافت'' بن گئی تھی- اور دوسرے یہ کہ اس خطے میں علامہ اقبال مرحوم ایسی عظیم شخصیت پیدا ہوئی جس کی انتہائی پُر درد اور پُر تأثیر حدی خوانی نے قافلۂ ملی کو خوابِ غفلت سے بیدار کر دیا اور مسلمانانِ ہند کو جذبۂ ملی سے سرشار کر دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی ملی شاعری کو اسلام کی نشأۃِ ثانیہ اور تجدید واحیائے دین کی وسیع الاطراف جدوجہد میں ایک اہم مقام حاصل ہے۔ اور اس پس منظر میں دیکھا جائے تو ۱۹۷۴ء میں عالمی

اسلامی سربراہی کانفرنس کا پاکستان اور خاص طور پر اس شہر لاہور میں انعقاد بہت معنی خیز تھا' جہاں قریباً نصف صدی قبل قراردادِ پاکستان بھی منظور ہوئی تھی اور جہاں دورِ حاضر میں قافلۂ ملت اسلامیہ کا وہ سب سے بڑا حدی خواں بھی مدفون ہے جو آخری دم تک یہ صدا لگاتا رہا کہ:۔

بیا تا کارِ ایں اُمت بسازیم
قمارِ زندگی مردانہ بازیم
چناں نالیم اندر مسجد شہر
دلے در سینۂ مُلّا گدازیم

اس ہمہ جہتی احیائی عمل کا دوسرا اہم گوشہ وہ ہے جس میں علمائے کرام کی مختلف جماعتیں اور تنظیمیں سرگرم کار اور اپنے اپنے مخصوص انداز میں اسلام اور مسلمانوں کی خدمت میں مصروف ومشغول ہیں' اور واقعہ یہ ہے کہ اس پہلو سے بھی برصغیر پاک وہند کو پورے عالم اسلام میں ایک امتیازی مقام حاصل ہے۔ چنانچہ علماء دین کو جس قدر اثر ورسوخ یہاں کے مسلمان عوام پر حاصل ہے وہ دنیا میں کہیں اور نظر نہیں آتا' اور راسخ العقیدہ اسلام جتنی مضبوط جڑیں یہاں رکھتا ہے کہیں اور نہیں رکھتا۔ (۱۹۶۸ء میں جو ایجی ٹیشن ڈاکٹر فضل الرحمٰن مرحوم کی کتاب ''اسلام'' کے خلاف ہوا تھا اور پھر ۱۹۷۴ء میں جو معجزہ قادیانی مسئلے کے حل کی صورت میں صادر ہوا وہ اس کے مُنہ بولتے ثبوت ہیں) حتیٰ کہ جزیرہ نمائے عرب بھی' جہاں اس صدی کے وسط تک محمد بن عبدالوہابؒ کی تجدیدی مساعی کے گہرے اثرات قائم رہے ہیں' اب اس معاملے میں بہت پیچھے رہ گیا ہے!

اس کی وجہ بھی بادنیٰ تأمل سمجھ میں آجاتی ہے' اور وہ یہ کہ امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ ایسی جامع شخصیت گزشتہ تین سو سال کے دوران میں پورے عالم اسلام میں پیدا نہیں ہوئی' اور انہوں نے مسلمانوں کی توجہ علم دین کے اصل سرچشموں یعنی قرآن اور حدیث کی

جانب منعطف کرانے کے ساتھ ساتھ فکر اسلامی کی تدوینِ نو کا جو عظیم الشان کارنامہ انجام دیا اسی کا نتیجہ ہے کہ یہاں دین اور رجالِ دین کی ساکھ از سرِ نو مضبوط ہوگئی۔ اس ضمن میں یہ حقیقت بھی پیش نظر رکھنی چاہیے کہ علماء دین کی مساعی میں اصل زور دورِ حاضر میں اسلام کی نشأۃ ثانیہ اور تجدید و احیائے دین کے تقاضوں کو پورا کرنے کے بجائے دین کے نظامِ عقائد و اَعمال کی حفاظت و مدافعت پر ہے۔ اس طرح ان کی خدمات کو سابق مجددین اسلام کی مساعی کے ساتھ ایک نوع کے تسلسل کی نسبت حاصل ہے' اس لیے کہ جملہ مجددینِ اُمت کی مساعی کی اصل نوعیت بھی احیاءِ دین یا اقامت دین کی نہیں بلکہ حفاظت و مدافعت دین ہی کی تھی' اور یہ اس لیے کہ ابھی اسلام کا قصرِ عظیم بالکل زمین بوس نہیں ہوا تھا' اور خواہ دین کی حقیقی روح کتنی ہی مضمحل اور پژمردہ ہو چکی ہو' بہر حال اسلام نے جو تہذیبی اور قانونی نظام دنیا میں قائم کیا تھا اس کا ڈھانچہ برقرار تھا' حتیٰ کہ شریعت اسلامی اکثر مسلمان ممالک میں بالفعل نافذ تھی۔ چنانچہ تمام تجدیدی مساعی کا اصل ہدف یہ رہا کہ دین کا نظامِ عقائد و اَعمال محفوظ اور اپنی اصل صورت میں قائم رہے اور خارجی و بیرونی اثرات دین کو مسخ نہ کر دیں۔

یہی وجہ ہے کہ امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے دور تک کے تمام مجدّدینِ اُمت علیہم الرحمۃ کی مساعی اکثر و بیشتر علم و فکر کے میدان ہی تک محدود رہیں اور عقائد و نظریات کی تصحیح و اصلاح ہی کو اُن کے اصل ہدف کی حیثیت حاصل رہی' اور اس سے آگے اگر قدم بڑھا بھی تو زیادہ سے زیادہ اصلاحِ اخلاق و اعمال' تزکیۂ نفس اور تربیتِ روحانی تک۔ اس سے آگے بڑھ کر گزشتہ صدی سے قبل کسی بھی مجدّدِ دین کی جدوجہد نے سیاسی یا عسکری تحریک کی صورت اختیار نہیں کی۔

اس کا ایک اہم سبب یہ بھی تھا کہ نبی اکرم ﷺ نے مسلمان حکمرانوں کے خلاف ''خروج''، یعنی مسلح بغاوت پر نہایت سخت بندشیں عائد فرما دی تھیں' اور جب تک ان کے ہاتھوں شریعتِ اسلامی کا نفاذ ہو رہا تھا اور کسی ''کفر بواح''، یعنی کھلے اور صریح کفر کی ترویج و

تنفیذ نہیں ہو رہی تھی ان کے ذاتی فسق و فجور اور ظلم و جور کے باوجود ان کے خلاف مسلح بغاوت ممکن نہ تھی —— یہی وجہ ہے کہ جیسے ہی یہ صورت حال تبدیل ہوئی اور حکومت مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکل کر غیر مسلم اقوام کے ہاتھوں میں آئی' دفعتہً ان مساعی میں عسکریت بھی پیدا ہوگئی' جس کی سب سے شاندار اور تابناک مثال خانوادۂ ولی اللّٰہی کے زیر اثر برپا ہونے والی تحریک شہیدین رحمہما اللہ ہے۔ عالم عرب میں اس کی متوازی تحریکوں کے طور پر مہدی سوڈانیؒ اور شیخ سنوسیؒ کی مساعی کو شمار کیا جا سکتا ہے۔

البتہ یہ حقیقت پیش نظر رہنی ضروری ہے کہ عہد حاضر میں' بالخصوص برعظیم پاک و ہند میں' علماء کرام کی خدمات دو اعتبارات سے اصلاح طلب بھی ہیں۔ مثلاً ایک یہ کہ جب سے اجتہاد کا دروازہ بند ہوا اور تقلید جامد کا دَور دَورہ ہوا اور تشتّت و انتشار اور فرقہ پرستی و گروہ بندی نے پاؤں جما لیے' ہر فرقے کے علماء کرام دین کے نظامِ عقائد و اعمال کی خاص اسی صورت کی حفاظت و مدافعت پر سارا زور صرف کر رہے ہیں جو اُن کے مخصوص فرقے یا گروہ کے نزدیک معتبر و مستند ہے' جس سے فرقہ بندی کی جڑیں مضبوط تر ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ دوسرے چونکہ انہوں نے علومِ جدیدہ اور دورِ حاضر کے افکار و نظریات کا مطالعہ اس طرح براہِ راست اور بالاستیعاب نہیں کیا جس طرح اپنے اپنے دَور میں امام غزالیؒ اور امام ابن تیمیہؒ نے کیا تھا' لہٰذا وہ دورِ حاضر میں حفاظت و مدافعت دین کے اصل تقاضوں کو بھی صحیح طور پر پورا کرنے سے قاصر ہیں۔ گویا دورِ حاضر میں علماء دین کی حیثیت دین کے جہاز کو آگے بڑھانے والی قوت فراہم کرنے والے انجن کی تو نہیں ہے' البتہ کم از کم برعظیم پاک و ہند کی حد تک ایک ایسے بھاری لنگر کی ضرور ہے جو اس کشتی کو غلط رخ پر بڑھنے سے روکنے کی خدمت بہرحال سرانجام دے سکتا ہے' اور فی زمانہ یہ بھی ایک اہم خدمت ہے۔

برعظیم میں اس سلسلے میں ایک اہم مقام اور مرتبہ دیو بندی مکتب فکر کو حاصل ہے جو امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے ''فکر'' کا نہ سہی ''علم'' کا وارث ضرور ہے' اور جس کی کوکھ سے دینی مدرسوں اور دار العلوموں کے ایک عظیم سلسلے کے علاوہ ایک عظیم تحریک بھی برآمد

ہوئی ہے جس نے راسخ العقیدہ اسلام کی جڑوں کی آبیاری کے ساتھ ساتھ توجہات کو حقائق ایمانی پر مرکوز کر دیا' اور جس کے زیر اثر کم از کم ایسے لوگ ضرور دین سے قریب ہو رہے ہیں جن کے اذہان فکری و نظری اشکالات سے خالی ہوتے ہیں اور جن کے قلوب میں نیکی کا ایک جذبہ' خواہ نیم خوابیدہ حالت ہی میں سہی' بہرحال موجود ضرور ہوتا ہے۔ ہماری مراد ''جماعت تبلیغی'' سے ہے جس نے اس دَور میں دین و مذہب کے نام پر ایک عظیم حرکت عالم اسلام ہی نہیں' دیارِ غیر میں بھی برپا کر دی ہے' اور جس کے زیر اثر عوامی سطح ہی پر سہی بہرحال ''تجدید ایمان'' کی ایک تحریک بالفعل برپا ہو گئی ہے' اور جسے بلاشبہ زیر بحث ہمہ جہتی احیائی عمل میں ایک اہم مقام حاصل ہے۔ حال ہی میں بعض دوسرے مذہبی حلقوں نے بھی اسی طرز پر کام کا آغاز کر دیا ہے۔ اللہ کرے کہ اس سے فرقہ واریت کو فروغ نہ ہو بلکہ ایمان کی باطنی کیفیات اور شعائر اسلامی کی پابندی کو تقویت حاصل ہو۔

اس ''ہمہ جہتی احیائی عمل'' کا تیسرا اور اہم ترین گوشہ وہ ہے جس میں وہ جماعتیں اور تنظیمیں برسرکار ہیں جو قائم ہی خالص احیائی مقاصد کے تحت ہوئیں اور جنہیں اب اس احیائی عمل کے اعتبار سے گویا مقدمۃ الجیش کی حیثیت حاصل ہے۔ مختلف مسلمان ممالک میں ایسی جماعتیں اور تنظیمیں مختلف ناموں کے تحت کام کرتی رہی ہیں' لیکن ''ہے ایک ہی جذبہ' کہیں واضح کہیں مبہم'' اور ''ہے ایک ہی نغمہ کہیں اونچا کہیں مدھم!'' (جناب نعیم صدیقی) کے مصداق ان کی حیثیت ایک ہی تحریک کے تحت کام کرنے والی مختلف تنظیمی ہیئتوں کی ہے۔

ان جماعتوں میں اگرچہ ایک دَور میں جوش اور جذبے کی شدت اور اثر و نفوذ کی وسعت کے اعتبار سے مصر کی الاخوان المسلمون توجہات اور امیدوں کا مرکز بن گئی تھی' لیکن واقعہ یہ ہے کہ احیائی عمل کے اس گوشے میں بھی اصل اہمیت برعظیم پاک و ہند ہی کو حاصل ہے۔

برعظیم میں اس تحریک احیائے دین کے مؤسس اوّلین اور داعیٔ اوّل کی حیثیت مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کو حاصل ہے‘ جنہوں نے اس صدی کے بالکل اوائل میں ’’الہلال‘‘ اور ’’البلاغ‘‘ کے ذریعے ’’حکومتِ الٰہیہ‘‘ کے قیام اور اس کے لیے ایک ’’حزب اللہ‘‘ کی تأسیس کی پُرزور دعوت پیش کی۔ مولانا کے مخصوص طرزِ نگارش اور اندازِ خطابت نے‘ خصوصاً تحریک خلافت کے دوران میں‘ اُن کی شہرت کو برعظیم کے طول وعرض میں پھیلایا اور ان کی دعوت نے لاکھوں مسلمانوں کے دلوں کو مسخر کرلیا‘ لیکن اس کے بعد بعض وجوہ کی بناپر‘ جن کے بیان کا یہ موقع نہیں ہے‘ انہوں نے دفعتہً اس عظیم مشن کو خیرباد کہہ کر انڈین نیشنل کانگرس میں شمولیت اختیار کرلی اور باقی پوری زندگی پوری یکسوئی اور کمال مستقل مزاجی کے ساتھ ہندوستان کی نیشنلسٹ سیاست کی نذر کردی۔ (راقم نے اس موضوع پر مفصل بحث اپنی تالیف ’’جماعت شیخ الہندؒ‘‘ میں کی ہے)۔

اس طرح مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم تو میدان چھوڑ گئے‘ لیکن ان کی زوردار دعوت کی گھن گرج سے مسلم انڈیا کی فضائیں دیر تک گونجتی رہیں‘ اور پھر کم وبیش دس ہی سال بعد مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے مولانا آزاد کو اُن کی زندگی ہی میں مرحوم قرار دے کر ان کے ترک کردہ مشن کو اختیار کرنے کے عزمِ مصمم کے ساتھ ان کی تفسیر ’’ترجمان القرآن‘‘ ہی کے ہم نام ماہنامے کی ادارت سنبھالی اور اس کے ذریعے اسی ’’حکومت الٰہیہ‘‘ کے قیام کا نصب العین اور ’’تجدید واحیائے دین‘‘ کی سعی کا ایک نقشہ مسلمانانِ ہند کے سامنے پیش کرنا شروع کردیا‘ اور پہلے چھ سات برس تک پورے صبر واستقلال کے ساتھ خالص انفرادی طور پر کام جاری رکھا‘ پھر کچھ عرصہ ’’دارالاسلام‘‘ کے نام سے جو ادارہ علامہ اقبال کے ایک عقیدت مند چوہدری نیاز علی خاں نے قائم کیا تھا اس کے تحت کام کیا‘ اور بالآخر ۱۹۴۱ء میں ’’جماعت اسلامی‘‘ کے نام سے ایک جماعت کی بنیاد رکھ دی اور ایک منظّم جدوجہد کا آغاز کردیا۔

سب جانتے ہیں کہ کئی صدیوں سے عالم اسلام میں علمی وثقافتی مراکز دو ہی رہے ہیں‘ عالم عرب میں مصر اور غیر عرب مسلم دنیا میں ہندوستان۔ چنانچہ بیسویں صدی عیسوی کی

احیائی تحریکیں بھی ان ہی دوملکوں سے اُٹھیں۔ لیکن تقریباً نصف صدی کے عرصے میں مصر کی تحریک اسلامی کے اثرات تمام عرب ممالک تک پہنچ گئے جن میں کم وبیش بیس پچیس کروڑ مسلمان آباد ہیں۔ اور ہندوستان تو تھا ہی ایک برعظیم جس کے چار ٹکڑوں میں (اس لیے کہ اب کشمیر بھی بالقوہ تو بھارت سے جدا ہو ہی چکا ہے) لگ بھگ چالیس کروڑ مسلمان آباد ہیں' جن کی نوجوان نسل کا معتد بہ حصہ تحریک اسلامی کے زیر اثر آیا ہے۔ ایران کا معاملہ خود اپنی جگہ ایک جداگانہ نوعیت کا حامل ہے۔ اس صدی کے آغاز تک وہ باقی مسلم دنیا سے الگ تھلگ گویا اپنے ہی خول میں بند تھا۔ پھر دوسرے ممالک کی احیائی تحریکوں کی فہرست میں ایران کے ''فدائین'' کا بھی ذکر سنائی دیا' لیکن اس کے بعد پھر کچھ خاموشی سی طاری رہی' تاآنکہ اچانک ایک طوفان کی سی کیفیت کے ساتھ ایران میں انقلاب آیا اور وہ بعض اعتبارات سے تو پوری مسلم دنیا سے آگے نکل گیا۔

مزید برآں ان تمام مسلمان ممالک سے جونوجوان ساٹھ کی دہائی میں حصولِ تعلیم کے لیے امریکہ' انگلستان اور یورپ کے دوسرے ممالک گئے اور پھر وہیں آباد ہو گئے ان کے ذریعے ان تحریکوں کے اثرات مغربی دنیا میں بھی قابل لحاظ واحساس حد تک پہنچ چکے ہیں' چنانچہ مغرب ان ہی کو ''مسلم فنڈ امنٹلسٹ'' کے نام سے پکار رہا ہے اور ان سے اپنی ''مثالی'' تہذیب وتمدن کو خطرہ محسوس کر رہا ہے۔ (فرعون نے بھی سورۂ طٰہٰ کی آیت ۶۳ کی رو سے حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کو اپنی ''مثالی'' تہذیب کے لیے خطرہ قرار دیا تھا) اور اس امر سے قطع نظر کہ ان تحریکوں کی نصف صدی سے زائد کی مساعی کا حاصل کیا ہے اور پالیسی اور طریق کار کے بارے میں اختلافات کے سبب سے یہ کتنی شاخوں میں تقسیم ہوئی ہیں' جیسے مثلاً عالم عرب میں مصر اور اردن میں بحیثیت مجموعی تو اِخوان نے پُرامن میانہ روی اختیار کی اور سماجی اور سیاسی سرگرمیوں کو اپنی پیش رفت کا ذریعہ بنایا' لیکن ان ہی سے علیحدگی اختیار کرنے والے زیادہ ریڈیکل عناصر نے تشدد اور دہشت گردی کا راستہ اختیار کر لیا' جیسے مصر کی کچھ عرصہ قبل کی ''التکفیر والھجرۃ'' اور حالیہ ''جماعۃ اسلامیۃ''۔ (اکتوبر

۱۹۷۹ء میں راقم نے قاہرہ میں اخوان کے مرشد عام عمر تلمسانی مرحوم سے ملاقات کی تھی تو انہوں نے تسلیم کیا تھا کہ ''التکفیر والهجرة ''اخوان ہی کے لوگ ہیں جو ہم سے علیحدہ ہو کر دہشت گردی کے راستے پر چل نکلے ہیں۔) اسی طرح اردن ہی کے تقی الدین نبہانی مرحوم نے کہیں زیادہ ریڈیکل ''حزب التحریر'' کی بنیاد رکھی۔ بہرحال یہ امر مسلّم ہے کہ یہ تحریکیں مجموعی اعتبار سے عالم اسلام میں احیاءِ اسلام کی امنگ کا مظہر ہیں اور اب عالمی سطح پر انہیں ایک امر واقعی کی حیثیت سے تسلیم کیا جا رہا ہے۔

الغرض' بیسویں صدی عیسوی میں ایک جانب تو سابقہ اور معزول شدہ اُمت مسلمہ یعنی یہود اور موجودہ اُمت مسلمہ یعنی مسلمانوں پر عذابِ الٰہی کے کوڑے بھی برستے رہے' لیکن دوسری جانب یہود کی بھی دو ہزار سالہ باسی کڑھی میں اُبال آیا اور وہ صیہونی تحریک کی زیر قیادت ''ارضِ موعود'' میں قدم جما کر عظیم تر اسرائیل کے قیام اور ہیکل سلیمانی کی تعمیر نو کی جانب پیش قدمی کے لیے پر تول رہے ہیں' اور خود مسلمان بھی مغربی استعمار کی کم از کم براہِ راست غلامی سے نجات پا کر (اس لیے کہ ابھی ریموٹ کنٹرول غلامی بتمام وکمال موجود ہے) اپنے دین کے احیاء اور اسلامی نظامِ حیات کے بہمہ وجوہ قیام ہی نہیں' عالمی غلبہ ٔ دین کے خواب دیکھ رہے ہیں' اور اس صدی کی آخری دہائی کے بقیہ حصے میں جو عظیم واقعات وحوادث رونما ہونے والے ہیں ان کی تہہ میں اصلاً ان ہی دو اُمتوں کی آخری آویزش کارفرما ہوگی' اگرچہ اس میں بظاہر زیادہ اہم اور نمایاں کردار ایک تیسری اُمت ادا کرے گی جو ابراہیمیؑ مذاہب کے ''ثالثُ ثلاثۃ'' یعنی تین میں کے تیسرے کی حیثیت رکھتی ہے۔ لہٰذا اس سے قبل کہ مستقبل کے واقعات وحوادث کے بارے میں کچھ بات کی جائے' کسی قدر گفتگو اس تیسری اُمت کے بارے میں ضروری ہے۔

(۵ر مئی ۱۹۹۳ء)

باب ششم

ابراہیمی مذاہب کا ''ثالث ثلاثہ''

''ثالثُ ثلاثۃ'' کے الفاظ قرآن حکیم میں سورۃ المائدۃ کی آیت ۷۳ میں عیسائیوں کے عقیدۂ تثلیث کے ضمن میں وارد ہوئے ہیں' یعنی ﴿لَقَدۡ کَفَرَ الَّذِیۡنَ قَالُوۡۤا اِنَّ اللّٰہَ ثَالِثُ ثَلٰثَۃٍ﴾ ''یقیناً کفر کیا ان لوگوں نے جنہوں نے کہا کہ اللہ تین میں کا تیسرا ہے!'' ''ثَالِثُ ثَلٰثَۃٍ'' (''تین میں کا تیسرا'') کے ان الفاظ میں ایک طنز اور تعریض مضمر ہے' جس کے فہم کے لیے اس حقیقت کی جانب توجہ ضروری ہے کہ اگرچہ تمام مشرکانہ مذاہب کے عقائد میں یہ قدرِ مشترک لازماً موجود ہوتی ہے کہ اوپر ایک بڑے خدا کو مان کر اس کے نیچے بہت سے چھوٹے خداؤں کو تسلیم کیا جاتا ہے' لیکن پھر اصل خدائی چھوٹے خداؤں ہی کی ہوتی ہے' بڑا خدا تو بس ایک ''دستوری سربراہ'' بن کر رہ جاتا ہے (جیسے ٹھیٹھ پارلیمانی نظام میں صدرِ ریاست!) چنانچہ ہندوؤں کے نزدیک ''مہادیو'' تو ایک ہی ہے جب کہ دیویاں اور دیوتا بے شمار ہیں۔ اسی طرح یونانی اور رومی میتھالوجی میں ''G'' سے لکھا جانے والا ''God'' تو ایک ہی ہوتا تھا' لیکن ''g'' سے لکھے جانے والے gods اور godesses اَن گنت تھے۔ اسی طرح اہل عرب اللہ کو تو واحد بھی مانتے تھے اور بلا شرکت غیرے کل کائنات کا خالق اور مالک بھی تسلیم کرتے تھے' لیکن ان کے نزدیک اس کے تحت ''اِلٰہ'' بہت سے تھے جن کو اللہ نے جملہ اختیارات تفویض کر دیے تھے۔ لیکن' جیسے کہ پہلے عرض کیا گیا' پھر اصل پوجا پاٹ' چڑھاوے اور نذرانے چھوٹی دیویوں اور دیوتاؤں اور گاڈز اور گاڈیسز اور ہبل یا لات و منات اور عزیٰ ہی کے لیے ہوتے تھے' بڑا خدا تو بس

''تین میں کا تیسرا'' بن کر رہ جاتا تھا۔

کچھ ایسا ہی معاملہ ابراہیمی مذاہب (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کے ضمن میں عیسائیت کا ہے کہ وہ تعدادِ نفوس کے اعتبار سے تو ابراہیمی مذاہب میں سب سے بڑا مذہب ہے' لیکن واقعہ یہ ہے کہ ابراہیمیؑ مذاہب کی جانب اس کی نسبت صرف حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے نام یا زیادہ سے زیادہ ان کی ذات اور شخصیت کی حد تک محدود ہے' ورنہ عقائد ونظریات کے اعتبار سے موجودہ عیسائیت ایک بالکل جدا مذہب ہے جس کا شمار ''فلسفیانہ مذاہب'' میں ہونا چاہیے نہ کہ ''آسمانی مذاہب'' میں' اور جس کی اصل نسبت سینٹ پال کی جانب ہونی چاہیے نہ کہ حضرت مسیح علیہ السلام کی جانب۔

بہرحال ہم جس موضوع پر سلسلہ وار کلام کر رہے ہیں اس کے اعتبار سے اس مذہب کے نام لیواؤں کا اہم ترین رول یہ ہے کہ دونوں اصل ابراہیمیؑ اُمتوں پر عذابِ الٰہی کے دوسرے دَور میں سزا کے کوڑے بالفعل ان ہی کے ہاتھوں پڑتے رہے ہیں۔ چنانچہ سابقہ ابراہیمیؑ اُمت یعنی یہود پر چوتھی صدی عیسوی کے اوائل سے لے کر' جب سلطنت روما نے عیسائیت اختیار کی تھی' بیسویں صدی عیسوی کے تقریباً وسط تک' گویا سولہ سو برس سے زائد عرصے تک' تشدّد وتعذیب' قتل وغارت' جلاوطنی اور ملک بدری کا سلسلہ مختلف عیسائی اقوام ہی کے ہاتھوں جاری رہا۔ (حالات وواقعات کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ اس پورے عرصے کے دوران میں یہودیوں کو اگر کوئی سہولت یا سہارا حاصل ہوا تو صرف ان مسلمانوں کی جانب سے جن کے وہ بدترین دشمن ہیں۔ چنانچہ انہیں کئی سو برس بعد یروشلم میں داخلے کی اجازت ملی تھی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے فرمان کے ذریعے' پھر مکابی سلطنت کے زوال کے بعد یعنی لگ بھگ آٹھ سو برس بعد اگر انہیں کہیں امن وسکون اور چین کا سانس لینا نصیب ہوا تھا تو بنوعباس کے عہد خلافت میں' اور مسلم سپین کو تو اِن کے زعماء اور دانشور برملا طور پر اپنے دورِ جلاوطنی یعنی ''Diaspora'' کا ''عہد زریں'' قرار دیتے ہیں۔) اسی طرح موجودہ ابراہیمی اُمت یعنی اُمت مسلمہ پر بھی گیارہویں صدی عیسوی کے بعد سے مسلسل عذابِ

الٰہی کے کوڑے عیسائیوں کے ہاتھوں پڑ رہے ہیں۔ چنانچہ اوّلاً گیارہویں اور بارہویں صدی کے دوران صلیبیوں نے شام، فلسطین اور مصر کے ساحلی علاقوں کو تاخت و تاراج کیا اور لاکھوں مسلمانوں کو قتل کیا، چنانچہ ۱۰۹۹ء میں بیت المقدس میں مسلمانوں کا قتل عام تو تاریخ انسانی کے بدترین واقعات میں شمار ہوتا ہے۔ پھر تیرہویں، چودھویں اور پندرہویں صدی کے دوران عیسائیوں نے تدریجاً ہسپانیہ میں اسلام اور مسلمانوں کو ختم کیا، تا آنکہ سولہویں صدی کے اوائل میں پورے جزیرہ نمائے آئی بیریا سے اسلام اور مسلمانوں کا نام و نشان تک مٹ گیا اور یورپ کے جنوب مغربی علاقے سے ''نسلی صفائی'' (Ethnic Cleansing) کا کام پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا (جو اَب پانچ سو برس بعد یورپ کے جنوب مشرقی کنارے یعنی بلقان کے علاقے میں ہو رہا ہے۔) بعد ازاں یورپ کی عیسائی اقوام کا سیلاب واسکوڈی گاما کے دریافت کردہ بحری راستے کے ذریعے مشرقِ اقصیٰ کے مسلمان ممالک پر ٹوٹ پڑا، اور سترہویں، اٹھارہویں اور انیسویں صدی کے دوران جاوا، ملایا، سماٹرا اور ہندوستان سے مسلمان حکومتوں کو ختم کرتے ہوئے بالآخر یہ سیلاب بیسویں صدی کے اوائل میں عظیم سلطنت عثمانیہ کو بھی بہا کر لے گیا اور پورا شرقِ اوسط اور شمالی افریقہ بھی عیسائی اقوام کے زیر نگیں آ گیا۔ بقول علامہ اقبال:

لے گئے تثلیث کے فرزند میراثِ خلیلؑ
خشتِ بنیادِ کلیسا بن گئی خاکِ حجاز!

الغرض، یہودیوں کے لیے سولہ سو برس تک اور مسلمانوں کے لیے ایک ہزار برس سے عیسائیوں نے عذاب کے کوڑے کا کردار ادا کیا ہے اور، جیسے کہ سطورِ گزشتہ میں واضح کر دیا گیا تھا، اگرچہ بیسویں صدی عیسوی کے دوران یہودیوں اور عیسائیوں کے مابین تعلقات کی نوعیت میں تو ایک انقلابِ عظیم رونما ہو چکا ہے، جس کے نتیجے میں اب مسیحی دنیا بالخصوص ''واسپ'' (WASP) یعنی "White Anglo Saxon Protestants" یہودیوں کے بظاہر معاون و محافظ اور مددگار و سرپرست، اور بباطن ع

''فرنگ کی رگِ جاں پنجۂ یہود میں ہے!'' کے مطابق زیرِنگیں اور حاشیہ بردار بن چکے ہیں۔ لیکن مسلمانوں کے معاملے میں ان کا سابقہ کردار پوری طرح برقرار ہے اور ''ترسم کہ دِگر خیزد'' کے مصداق اندیشہ ہے کہ عنقریب مغرب کی عیسائی اقوام کی ایک عظیم یلغار ﴿حَتّٰی اِذَا فُتِحَتْ یَاْجُوْجُ وَمَاْجُوْجُ﴾ (الانبیاء:۹۶) کی سی شان کے ساتھ عالم اسلام بالخصوص شرق اوسط پر ہونے والی ہے' جس کی صریح پیشین گوئیاں احادیث نبویہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں موجود ہیں' اور جس کی ایک ادنیٰ جھلک دنیا نے خلیج کی جنگ کے دوران دیکھ بھی لی ہے۔ اور جس کے آئندہ بھیانک تر مرحلے کا جواز فراہم کرنے کے لیے ''مسلم فنڈامنٹلزم'' کا ہوّا کھڑا کیا جا رہا ہے' جس کے ضمن میں حال ہی میں ﴿شَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ اَهْلِهَا ۚ﴾ (یوسف:۲۶) کے مصداق امریکی پروفیسر ڈاکٹر ایکسپوزیٹو نے اپنی حالیہ تالیف میں یہ ''سچی بات'' غالباً کسی ''مستی'' کے عالم میں کہہ دی ہے کہ ''مغرب یا عالم عیسائیت کو اسلام کی جانب سے کسی خطرے یا اندیشے کا واویلا بالکل بے جا اور غیر واقعی ہے' اس لیے کہ تاریخ شاہد ہے کہ آج تک عیسائی دنیا کو کبھی کوئی گزند اسلام کی جانب سے نہیں پہنچا' جب کہ واقعہ یہ ہے کہ اس کے برعکس ہمیشہ عالمِ اسلام ہی کو عیسائی دنیا کی جانب سے نقصان پہنچتا رہا ہے۔''

لیکن اس سے قبل کہ ہم ''آنے والے دور کی'' صرف ''دھندلی سی اِک تصویر'' نہیں بلکہ وہ واضح تصویر دیکھیں جو احادیث میں موجود ہے' آیئے کہ پہلے موجودہ دنیا میں مذاہب کے اعتبار سے ''انسانی جغرافیہ'' پر بھی ایک نگاہ ڈال لیں اور پھر ابراہیمیؑ مذاہب خصوصاً عیسائیت کا ایک مختصر سا جائزہ لے لیں۔

اِس وقت دنیا کی کل انسانی آبادی ساڑھے پانچ یا پونے چھ ارب کے لگ بھگ ہے۔ (ماہرین کا اندازہ ہے کہ ۲۰۰۰ء میں یہ آبادی چھ ارب تیس کروڑ ہو جائے گی)☆ اس میں سے نصف سے زائد آبادی تین ابراہیمیؑ مذاہب کی پیروکار ہے۔ چنانچہ شکاگو کی عیسائیوں اور یہودیوں کی مشترکہ ''نیشنل کانفرنس'' نے ۱۹۹۰ء میں جو ''انٹر فیتھ کیلنڈر'' شائع کیا تھا اس کے

☆ واضح رہے کہ یہ تحریر ۱۹۹۳ء کی ہے۔ اس وقت دنیا کی آبادی چھ ارب ستر کروڑ ہو چکی ہے۔ (۲۰۰۸ء)

مطابق اب سے تین سال قبل دنیا میں یہودیوں کی کل آبادی ڈیڑھ کروڑ سے بھی کم، مسلمانوں کی ایک ارب سے زائد اور عیسائیوں کی پونے دو ارب کے لگ بھگ (اینگلی کن چرچ سات کروڑ، کیتھولک نوے کروڑ، آرتھوڈوکس تیرہ کروڑ اور پروٹسٹنٹ تریسٹھ کروڑ) تھی۔ اس میں اگر ان دوعوامل کا اضافہ کرلیا جائے کہ اوّلاً یہودیوں اور عیسائیوں میں تو آبادی کا اضافہ نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے، جب کہ مسلمانوں کے بارے میں مسلّم ہے کہ ان کی آبادی میں شرحِ اضافہ بہت زیادہ ہوتا ہے، اور ثانیاً مسلم اقلیت والے مما لک (بالخصوص بھارت) میں مسلمانوں کی تعداد بہت کم دکھائی جاتی ہے، تومحتاط اندازے کے مطابق اِس وقت دنیا میں ایک ارب تیس کروڑ (بعض لوگوں کے خیال میں پونے دو ارب) مسلمان موجود ہیں (واللہ اعلم)۔ مذکورہ بالا کیلنڈر کے مطابق ۱۹۹۰ء میں دنیا کے دوسرے مذاہب کے پیروکاروں میں سب سے بڑی تعداد ہندوؤں کی تھی، یعنی پینسٹھ کروڑ سے زائد، پھر بدھ مت کے پیروکار تھے، یعنی پچیس کروڑ کے لگ بھگ، پھر سکھ تھے، یعنی تقریباً پونے دو کروڑ، اور باقی صرف لاکھوں میں۔ ان میں بھی تین سال کے عرصے کے دوران کا اضافہ شامل کرلیا جائے اور پھر اس میں ایک ارب کے قریب لا مذہب یا نیچرورشپ والے لوگوں کو جمع کرلیا جائے تو کل حاصل جمع وہی بن جاتا ہے جو اوپر دیا گیا۔

قرآن حکیم پر ایمان اور قرآن کے فلسفۂ تاریخ سے واقفیت رکھنے والا ہر شخص جانتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر ایں دم تک دینِ برحق اسلام ہی رہا ہے، اور دنیا کے باقی جملہ مذاہب آسمانی ہدایت اور انبیاء اور رسولوں کی لائی ہوئی تعلیمات ہی کی محرف اور تبدیل شدہ صورتیں ہیں، لیکن ان میں سے اکثر کی صورتیں اتنی بدل چکی ہیں کہ اب بقولِ جگر مراد آبادی ؏ ''کہ پہچانی ہوئی صورت بھی پہچانی نہیں جاتی!'' البتہ صرف دو مذہب وہ ہیں جن کا اصل ''اسلام'' کے ساتھ تعلق اور تسلسل کم ازکم تاریخی اعتبار سے ثابت ہے، یعنی یہودیت اور نصرانیت۔ اور جیسے کہ اس سے قبل تفصیل سے واضح کیا جا چکا ہے، ان میں سے بھی اصل مسلمان اُمتیں دو ہی ہیں، یعنی سابقہ اُمت مسلمہ بنی اسرائیل اور موجودہ اُمت مسلمہ یا مسلمان۔ اور آئندہ اصل اور فیصلہ کن معرکہ تو ان ہی کے مابین ہوگا، لیکن مستقبل قریب

میں ابتداءً نمایاں کردار ادا کریں گے ابراہیمیؑ مذاہب کے ''تین میں کے تیسرے'' مذہب کے پیروکار یعنی عیسائی۔ لہٰذا ان کے بارے میں قرآنی نقطۂ نظر کی کسی قدر وضاحت ضروری ہے۔

موجودہ عیسائی مذہب اگرچہ ان چار بڑے بڑے فرقوں میں منقسم ہے جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے (بلکہ ان کی مزید تقسیم در تقسیم کے نتیجے میں انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے مطابق اس وقت بائیس ہزار سے زائد ''چرچ'' وجود میں آ چکے ہیں) تاہم ان سب کے مابین تثلیث' صلیب اور کفارہ کے عقائد متفق علیہ ہیں۔ قرآن حکیم تثلیث کی تو شدت کے ساتھ نفی کرتا ہی ہے' اس خیال کی بھی پرزور تردید کرتا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام سولی پر چڑھائے گئے جہاں ان کی موت واقع ہوئی' جس سے کفّارے کا عقیدہ بھی خود بخود منہدم ہو جاتا ہے۔ الحمد للہ کہ اگرچہ صلیب کا واقعہ تو اناجیل اربعہ میں موجود ہے' لیکن تثلیث یا ابنیت مسیحؑ کے عقیدے کی کوئی بنیاد ان میں ہرگز موجود نہیں' اور ان کا اوّلین سراغ تو اگرچہ سینٹ پال کی تحریروں میں مل جاتا ہے' تاہم انہیں باضابطہ اور سرکاری طور پر طے شدہ عقائد کی حیثیت بہت بحث و تمحیص اور جدل و نزاع کے نتیجے میں حضرت مسیح علیہ السلام کے لگ بھگ تین سو برس بعد حاصل ہوئی' اور اس عرصے کے دوران موحدین اور تثلیث کے قائلین کے مابین شدید خون خرابہ بھی ہوا۔ جہاں تک حضرت مسیحؑ کی ذات اور شخصیت کا تعلق ہے' چند امور تو وہ ہیں جو ایک جانب قرآن حکیم اور احادیثِ نبویہ ؐاور دوسری جانب اناجیل اربعہ کے مابین مشترک ہیں' لہٰذا مسلمانوں اور عیسائیوں کے مابین متفق علیہ عقائد کی حیثیت رکھتے ہیں' جب کہ بعض امور ایسے ہیں جن میں قرآن اور اناجیل تو متفق ہیں' لیکن سینٹ پال کی ترامیم کے باعث عیسائیت ان کی قائل نہیں' اور بعض امور ایسے بھی ہیں جو قرآن اور اناجیل کے مابین بھی مختلف فیہ ہیں۔ چنانچہ متفق علیہ امور تو یہ ہیں کہ:

ا) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش معجزانہ طور پر بن باپ کے ہوئی' لیکن چونکہ ان کی والدہ ماجدہ حضرت مریم صدیقہ رضی اللہ عنہا اسرائیلی تھیں' لہٰذا حضرت مسیحؑ کا تعلق بھی بنی اسرائیل

سے ہے۔

۲) ان کے دست مبارک سے ایسے عظیم معجزے صادر ہوئے جن کی نہ کوئی دوسری مثال موجود ہے نہ ہی ان سے بڑے حسی معجزوں کا تصور ممکن ہے۔ جیسے مردوں کو زندہ کر دینا' گارے سے پرندے کی صورت بنانا اور پھر اس میں پھونک مار کر اسے زندہ اور اُڑتا ہوا پرندہ بنا دینا' وغیرہ۔ (واضح رہے کہ قرآن حکیم معنوی اور ابدی معجزہ ہونے کے اعتبار سے ان جملہ معجزات سے افضل ہے' لیکن اس کا اعجاز صرف دل کی آنکھ اور عقل کی نگاہ سے دیکھا جا سکتا ہے' سر کی آنکھ سے نہیں!)

۳) انہوں نے یہودیوں میں توبہ کی زبردست منادی کی اور انہیں اخلاقی اور روحانی اصلاح کی زوردار دعوت دی' اور اس ضمن میں ان کے علماء' مفتیوں' قاضیوں اور ان کی ریاکارانہ مذہبیت پر شدید تنقیدیں کیں' چنانچہ مذہب کے یہ اجارہ دار طبقات آنجنابؑ کے شدید دشمن اور جان کے درپے ہو گئے۔

۴) ان کی زوردار دعوت کا شور اور غلغلہ تو بہت بلند ہوا' اور یروشلم اور آس پاس کے علاقے کے یہودی عوام اس سے متأثر بھی بہت ہوئے' لیکن ان پر ایمان بہت ہی کم لوگ لائے اور ان میں سے بھی صرف چند حواری ایسے تھے جو ان کے دن رات کے ساتھی اور دل و جان سے فدائی تھے۔ (اناجیل کی رُو سے ان کی تعداد بارہ تھی' اگرچہ مختلف اناجیل میں ناموں کا اختلاف ہے۔)

۵) بالآخر اللہ تعالیٰ نے انہیں زندہ آسمان پر اُٹھا لیا اور قیامت کے قریب وہ دوبارہ زمین پر نازل ہوں گے۔

یہ بات بڑی اہمیت کی حامل اور نہایت توجہ کے قابل ہے کہ دنیا کی کل آبادی کا نصف سے زائد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ذاتِ مبارکہ کے بارے میں ان پانچ امور پر متفق ہے' جن میں سے بعض باتیں نہایت غیر معمولی اور خالص خرقِ عادت یعنی دنیا کے عام طبعی قوانین کے بالکل برعکس ہیں!

اب آیئے ان دو نہایت اہم اور اساسی امور کی جانب جن پر قرآن و حدیث اور اناجیل اربعہ تو متفق ہیں، لیکن سینٹ پال کی اختیار کردہ ترمیمی آراء اور اقدامات کی بنا پر موجودہ عیسائیت کا موقف اور طرزِ عمل ان سے مختلف ہی نہیں متضاد ہے۔ وہ دو امور حسب ذیل ہیں:

۱) حضرت مسیح علیہ السلام نہ کوئی نئی شریعت لائے تھے، نہ ہی انہوں نے شریعت موسوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کو منسوخ کیا، بلکہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ہی کی لائی ہوئی شریعت کی تجدید وتوثیق اور بنی اسرائیل کی اخلاقی وروحانی اصلاح اور دین کی حقیقی روح کے احیاء کے لیے مبعوث ہوئے تھے۔ گویا وہ اپنی ذات کی حد تک سابقہ اُمت مسلمہ ہی سے تعلق رکھتے تھے اور کسی نئے دین و مذہب یا ملت و اُمت کے بانی نہیں تھے۔ چنانچہ مشہورِ زمانہ تالیف "The 100" کے مؤلف ڈاکٹر مائیکل ہارٹ نے بالکل صحیح کہا ہے کہ جب تک حضرت مسیحؑ دنیا میں موجود رہے، آپؑ اور آپؑ کے ساتھیوں کی حیثیت یہود ہی کی ایک جماعت یا زیادہ سے زیادہ فرقے کے علاوہ کچھ نہ تھی! گویا موجودہ مسیحیت کے اصل بانی حضرت مسیحؑ نہیں، سینٹ پال ہیں، جنھوں نے نہ صرف یہ کہ شریعت موسویؑ کو عیسائیوں کے لیے منسوخ قرار دیا، بلکہ خود شریعت ہی کی کلی نفی کر دی اور اسے (معاذ اللہ) ''لعنت'' قرار دیا۔

۲) حضرت مسیح علیہ السلام کی دعوت صرف بنی اسرائیل کے لیے تھی۔ چنانچہ آنجنابؑ نے خود اپنی دعوت اور خطاب کو بھی صرف بنی اسرائیل تک محدود رکھا اور صاف فرمایا: ''میں صرف اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کی تلاش میں آیا ہوں!'' اور اپنے شاگردوں کو بھی سختی کے ساتھ منع فرما دیا کہ اپنی دعوت و تبلیغ کے دائرے کو بنی اسرائیل کے باہر وسعت نہ دیں۔ چنانچہ اس معاملے میں بھی ''انقلابی قدم'' سینٹ پال ہی نے اٹھایا۔ یہی وجہ ہے کہ پہلی صدی عیسوی کی چالیس کی دہائی کے دوران اس معاملے میں حضرت مسیح کے ماننے والوں کے محدود حلقے میں شدید بحث ونزاع کا بازار گرم رہا، لیکن بالآخر فتح سینٹ پال اور ان کے حامیوں ہی کو حاصل ہوئی۔ چنانچہ اس کے بعد عیسائیت کو

اصل فروغ غیر اسرائیلی اقوام ہی میں ہوا' اور آج عیسائیوں میں نسلی طور پر بنی اسرائیل سے تعلق رکھنے والے لوگوں کا تناسب آٹے میں نمک کی مقدار سے بھی بہت کم ہے۔

آخر میں اس واحد اہم اور اساسی امر پر بھی نگاہ ڈال لیں جس کے معاملے میں ایک جانب قرآن وحدیث اور دوسری جانب اناجیل اربعہ میں واضح اختلاف بلکہ کھلا تضاد ہے —— یعنی یہ کہ اناجیل اربعہ کے مطابق یہودی علماء کے فتوے اور ان کی مذہبی عدالت کے فیصلے کے مطابق' بلکہ ان کے اصرار پر رومی حاکم پیلاطس پونٹس نے حضرت مسیح علیہ السلام کو سولی پر چڑھا دیا جہاں ان کی موت واقع ہوگئی' اگرچہ بعد میں جب کہ ان کا جسد خاکی ایک غار میں رکھا ہوا تھا' وہ زندہ ہوگئے اور اپنے بعض شاگردوں کو اپنی واپسی اور دوبارہ دنیا میں آنے کی نوید سنا کر آسمان پر چلے گئے۔ جب کہ قرآن حکیم ان کے مصلوب یا قتل ہونے کی شدت سے نفی کرتا ہے' اور صحیح اور مستند ترین احادیث صراحت کرتی ہیں کہ آنجنابؑ زندہ آسمان پر اٹھا لیے گئے تھے اور قیامت کے قریب دوبارہ زمین پر نازل ہوں گے اور اس کے بعد ہی آپؑ پر طبعی موت کا مرحلہ آئے گا۔ تاہم قرآن اور حدیث دونوں میں یہ تفصیل موجود نہیں ہے کہ آنجنابؑ کا رفع سماوی کب' کہاں اور کس مرحلے پر ہوا اور آپؑ کی جگہ کون مصلوب ہوا۔ البتہ یہ خلا بتمام وکمال انجیل برنباس کے ذریعے پُر ہو جاتا ہے' یعنی عین اُس وقت جب حضرت مسیحؑ کے ایک غدار حواری یہوداہ اسکریوتی کی مخبری پر رومی سپاہی آنجنابؑ کی گرفتاری کے لیے اس باغ میں داخل ہوئے جہاں آپؑ روپوش تھے' اللہ کے حکم سے چار فرشتے نازل ہوئے جو آنجنابؑ کو اٹھا کر لے گئے' اور اس غدار حواری کی صورت آپؑ کے مشابہ بنا دی گئی۔ چنانچہ وہی گرفتار ہوا اور بالآخر مصلوب ہو کر کیفر کردار کو پہنچ گیا۔

(واضح رہے کہ عیسائی یہ تو تسلیم کرتے ہیں کہ سینٹ برنباس حضرت مسیحؑ کے اوّلین مبلغین میں سے تھے' یہاں تک کہ ابتدا میں خود سینٹ پال کی حیثیت ان کے نائب کی تھی' لیکن متذکرہ بالا انجیل کی نسبت ان کی جانب درست نہیں سمجھتے' بلکہ اسے جعلی اور فرضی قرار دیتے ہیں۔ اور چونکہ اس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر آپؐ کے اسم گرامی کی صراحت کے ساتھ

بکثرت موجود ہے لہٰذا عیسائی اسے کسی مسلمان کی تصنیف قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ اس خیال کی تردید کے لیے صرف یہ "قرائن کی شہادت" کفایت کرتی ہے کہ اگر واقعتاً ایسا ہوتا تو اس انجیل کا تذکرہ مسلمانوں کے لٹریچر میں ہونا لازمی تھا' جب کہ واقعہ یہ ہے کہ اس کا حوالہ پورے مسلم لٹریچر میں کہیں موجود نہیں۔ چنانچہ قرآن مجید کی جملہ تفاسیر حضرت مسیح علیہ السلام کے رفع سماوی کے وقت اور مقام کی تفاصیل اور اس سوال کے جواب سے خالی ہیں کہ حضرت مسیح علیہ السلام کی جگہ کون شخص مصلوب ہوا؟ اس لیے کہ قرآن حکیم حضرت مسیحؑ کے مصلوب ہونے کی تو شدت کے ساتھ نفی کرتا ہے' لیکن واقعۂ صلیب کی مطلق نفی نہیں کرتا۔)

حاصل کلام یہ کہ اگرچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شخصیت اور تورات اور عہد نامۂ قدیم کی دیگر کتابوں کی بائبل میں شمولیت کی بنا پر عیسائیت ابتدا میں یقیناً ابراہیمیؑ مذاہب ہی کے سلسلے کی کڑی تھی' لیکن چونکہ زیادہ سے زیادہ تین سو سال بعد اس کی کامل قلب ماہیت ہو گئی تھی' چنانچہ موجودہ عیسائیت اپنے عقائد یعنی تثلیث' صلیب اور کفارہ کے حوالے سے اور شریعت موسویؑ سے انقطاع کے باعث ایک بالکل علیحدہ مذہب کی صورت اختیار کر چکی ہے جو آسمانی مذاہب کے مقابلے میں فلسفیانہ مذاہب سے قریب تر ہے' لہٰذا اب اس کی بقیہ دونوں ابراہیمی مذاہب سے کوئی مناسبت باقی نہیں رہی۔ لیکن چونکہ "آنے والے دَور" میں حضرت مسیحؑ کا نزول یا آپؑ کی آمد ثانی بجائے خود بھی نہایت اہم واقعہ ہو گا اور اس پر مستزاد اہم ترین عالمی تبدیلیوں کی تمہید بنے گا (اگرچہ آنجنابؑ کے نزول یا آمد ثانی کا مقصد اناجیل سے واضح نہیں ہوتا' بلکہ صرف نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث مبارکہ کے ذریعے سامنے آتا ہے اور وہ قرآن کے اس قانونِ عذاب کے عین مطابق ہے جس پر اس سے قبل گفتگو ہو چکی ہے' تاہم اس پر مفصل کلام بعد میں ہو گا) مزید برآں' چونکہ اس سے بھی پہلے ایک جھوٹا' مکار اور دجال شخص حضرت مسیحؑ ہی کے نام پر دنیا میں عظیم فساد برپا کرے گا' جس کی واضح پیشینگوئیاں احادیث نبویہؐ میں بھی موجود ہیں اور عہد نامہ جدید میں بھی' لہٰذا ضروری ہے کہ اناجیل اربعہ کے ساتھ تقابل سے قطع نظر' مثبت طور پر قرآن اور حدیث کے حوالے سے

حضرت مسیحؑ کی شخصیت پر مزید روشنی ڈال دی جائے۔(واضح رہے کہ متذکرہ بالا جھوٹے اور مکار شخص کو احادیث نبویہؐ میں ''المسیح الدجال'' کا نام دیا گیا ہے' اور عیسائی دنیا اسے "Anti-Christ" کے نام سے جانتی ہے۔ اور آج کل سولھویں صدی عیسوی کے ایک فرانسیسی نژاد' یہودی النسل عیسائی درویش ''ناسٹرے ڈیمس'' کی پیشینگوئیوں پر مبنی ویڈیو کیسٹوں کے ذریعے اس کا بہت چرچا مغربی دنیا میں ہو رہا ہے' اور اگرچہ عیسائی دنیا کی اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ قدیمی اور روایتی دشمنی کی بنا پر یہ پروپیگنڈا شدومد کے ساتھ کیا جا رہا ہے کہ یہ اینٹی کرائسٹ عرب مسلمانوں میں سے ہوگا' تاہم اس سے قطع نظر کہ وہ کس قوم سے ہوگا' یہ امر اپنی جگہ اہمیت کا حامل ہے کہ یہ تصور بھی عیسائیوں اور مسلمانوں کے مابین قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتا ہے۔)

بہرحال حضرت مسیح علیہ السلام کے بارے میں قرآن حکیم اور احادیث رسولؐ کی بنیاد پر ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ آنجنابؑ اللہ کے محبوب بندے' برگزیدہ نبی اور جلیل القدر رسول تھے۔ بحیثیت نبی آپؑ سلسلۂ انبیاء بنی اسرائیل کی آخری کڑی تھے اور بحیثیت رسول آپؑ کی بعثت بھی بنی اسرائیل ہی کی جانب تھی۔ آپؑ کی بعثت کا مقصد دین موسویؑ ہی کی تجدید و توثیق اور اس میں پیدا کردہ تحریفات کا ازالہ اور یہودیوں کی اخلاقی اور روحانی اصلاح تھا۔ مزید برآں آپؑ ایک جانب ان پیشینگوئیوں کے مصدِّق و مصداق بن کر آئے تھے جو انبیاءِ بنی اسرائیل یہود کے ایک نجات دہندہ کے ظہور کے بارے میں کرتے آئے تھے' اور دوسری جانب آپؑ خاتم النبیین اور آخر المرسلین محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے مبشر اور منادی کرنے والے بن کر آئے تھے (الصّف:٦)۔ آپؑ کی ولادت چونکہ بن باپ کے ہوئی تھی اسی لیے اللہ تعالیٰ نے آپؑ کو اپنی جانب سے ایک خاص روح اور اپنا ایک خصوصی کلمہ قرار دیا جو آپؑ کی والدہ ماجدہ حضرت مریم علیہا السلام کی جانب القاء کیا گیا' (النساء:١٧١)۔ ولادت کے فوراً بعد آپؑ سے یہ عظیم معجزہ بھی ظاہر ہوا کہ آپؑ نے پنگھوڑے میں سے بول کر اپنی والدہ ماجدہ کی پاکدامنی کی بھی گواہی دی اور اپنی نبوت و رسالت کا بھی اعلان کیا (مریم:٢٩ تا

۳۱)۔پھر جیسے کہ اس سے قبل عرض کیا جا چکا ہے' آپؑ کو عظیم ترین حسی معجزات عطا کیے گئے۔ گویا کہ بنی اسرائیل پر آپؑ کے ذریعے آخری درجہ میں اتمامِ حجت کر دیا گیا' لیکن اس سب کے باوجود یہود کی اکثریت بالخصوص ان کے علماء نے آپؑ کی تصدیق نہیں کی' بلکہ آپؑ کی والدہ ماجدہ پر بدکاری کی تہمت لگا کر آپؑ کو (معاذ اللہ) ولدالزنا بھی قرار دیا اور جادوگر اور کافر و مرتد قرار دے کر واجب القتل بھی ٹھہرایا' اور اپنے بس پڑتے تو آپؑ کو سولی پر چڑھوا کر ہی دم لیا۔ یہ دوسری بات ہے کہ "وہ نہ آپؑ کو قتل کر سکے نہ صلیب دے سکے' بلکہ اللہ نے آپؑ کا معاملہ ان کے لیے مشتبہ بنا دیا......اور انہوں نے آپؑ کو ہرگز قتل نہیں کیا' بلکہ اللہ نے آپؑ کو اپنی جانب اٹھا لیا!" (النساء:۱۵۷'۱۵۸) مزید برآں' قرآن نے بھی آپؑ کو "عِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ" (الزخرف:۶۱) "قیامت کی ایک نشانی" قرار دیا ہے' اور احادیث نبویہؐ میں تو یہ بات تواتر اور غایت درجہ صراحت اور وضاحت کے ساتھ بیان کی گئی ہے کہ آپؑ قیامت سے قبل نازل ہوں گے اور جھوٹے اور فریبی مسیح یعنی "المسیح الدجال" کو بنفسِ نفیس خود قتل کریں گے۔

"آنے والے دَور" کی ایک دھندلی نہیں واضح تصویر پر نظر ڈالنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مسئلے کو بھی تاریخی حقائق کے پس منظر میں سمجھ لیا جائے کہ یہ انقلابِ عظیم کیسے رونما ہوا کہ وہ یہودی جو ایک ہزار برس تک عیسائیوں کے نزدیک ارذِل خلائق اور مبغوض ترین لوگ رہے اور ان کے ظلم وتشدد کا نشانہ بنتے رہے' رفتہ رفتہ اس پوزیشن میں آ گئے کہ اس صدی کے اوائل میں نابغۂ عصر اور "برہمن زادۂ رمز آشنائے روم وتبریز" علامہ اقبال نے اپنے انگلستان اور جرمنی کے مختصر سے قیام کے دوران وہ حقیقت بچشمِ دِل دیکھ لی تھی جو آج پوری دنیا بچشم سر دیکھ رہی ہے' یعنی ؏ "فرنگ کی رگِ جاں پنجۂ یہود میں ہے!"

اللہ تعالیٰ نے سورۃ المائدۃ میں واضح کیا ہے کہ "ہم نے ان کے (یعنی یہود اور نصاریٰ کے) مابین قیامت کے دن تک کے لیے بغض اور عداوت پیدا کر دی ہے!" (المائدۃ:۱۴ و ۶۴) قرآن حکیم پر یقین رکھنے والا ہر سنجیدہ طالب علم اس سے یہ دو نتائج لازماً

اخذ کرے گا کہ اوّلاً یہودیوں اور عیسائیوں کا موجودہ ''گٹھ جوڑ'' محض ظاہری اور سطحی ہے اور ثانیاً اب دُنیا کا خاتمہ اور ﴿اِذَا وَقَعَتِ الۡوَاقِعَۃُ ﴾ کا مرحلہ زیادہ دور نہیں ہے' لیکن سردست اِن حقائق سے صرفِ نظر کرتے ہوئے نگاہوں کو یہودیوں اور عیسائیوں کے تعلقات کے تین اَدوار پر مرکوز کر دیجیے جن کا مختصر بیان حسب ذیل ہے:

۱) پہلا دَور عیسوی تقویم کی پہلی تین صدیوں پر محیط ہے جن کے دوران پیروانِ مسیح علیہ السلام کی تعداد قلیل تھی (اور ان میں معتد بہ تعداد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اصل موحد پیروکاروں کی بھی شامل تھی) چنانچہ ان پر دو جانب سے تشدد ہو رہا تھا' یعنی ایک یہودیوں کی طرف سے اور دوسرے بُت پرست رومیوں کی جانب سے۔

۲) اس صورتِ حال میں انقلاب چوتھی صدی عیسوی کے اوائل میں آ گیا جب سلطنت روما نے عیسائیت قبول کر لی۔ لہٰذا اب معاملہ برعکس ہو گیا اور یہودیوں پر عرصۂ حیات تنگ ہو گیا اور انہیں بدترین تشدد اور تعذیب کا نشانہ بننا پڑا۔ اس لیے کہ وہ عیسائیوں کے نزدیک حضرت مسیح علیہ السلام کے قاتل تھے' جن کی ذاتِ اقدس کے ساتھ ان کی محبت اور عقیدت کا ''غلو'' (النساء:۱۷۱) اس درجہ شدید تھا کہ انہیں الوہیت میں شریک کر دیا تھا۔ یہ دَور کم وبیش ایک ہزار سال تک جاری رہا۔

۳) اِس صورت حال میں جو انقلاب تدریجاً برپا ہوا جس کے نتیجے میں بالآخر یہودیوں اور عیسائیوں کا وہ ''گٹھ جوڑ'' پیدا ہوا جس کی پیشگی خبر قرآن حکیم نے ﴿بَعۡضُہُمۡ اَوۡلِیَآءُ بَعۡضٍ ﴾ (المائدۃ:۵۱) کے الفاظ میں دے دی تھی' وہ یہودی سیاست اور ذہانت کا شاہکار ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ اس کے لیے انہوں نے مسلمانوں کو آلۂ کار بنایا۔ چنانچہ پہلے انہوں نے آٹھویں صدی عیسوی کے اوائل میں ہسپانیہ کی فتح میں مسلمانوں کی مدد کی' اس لیے کہ ہسپانیہ کے عیسائی ان کے بدترین دشمن تھے اور انہیں توہین وتذلیل ہی نہیں تشدد وتعذیب کا نشانہ بنا رہے تھے' اور دنیا کا مسلّم اصول ہے کہ کسی کے دشمن کا دشمن اس کا دوست بن جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ وہ نکلا جس کا ذکر پہلے بھی ہو چکا ہے' یعنی مسلم سپین ان کے لیے

امن اور عافیت کا گہوارہ بن گیا۔ چنانچہ اسی سرزمین کو انہوں نے عیسائیت کے قلعے میں نقب لگانے کے لیے استعمال کیا اور غرناطہ اور قرطبہ کی یونیورسٹیوں سے علم کے جو سوتے پھوٹ کر فرانس اور جرمنی کی جانب بہہ نکلے ان پر ''لبرلزم'' کے عنوان سے ذہنی وفکری آوارگی اور اخلاقی وعملی بے راہ روی کے اضافی ردے چڑھا کر یورپ کے عیسائی معاشرے میں اپنے اثر ونفوذ کی راہیں ہموار کرلیں' اور پھر جب اوّلاً احیاء العلم (Renaissance) اور اصلاحِ مذہب (Reformation) کی تحریکوں' اور بالآخر پوپ کے اختیارات اور کلیسا کے اقتدار کے خلاف احتجاج (protest) کی تحریک کے نتیجے میں پاپائیت کی گرفت کمزور پڑی تو اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مختلف ممالک میں اس سودی کاروبار کی اجازت حاصل کرلی جو اس سے قبل عیسائی یورپ میں مطلقاً حرام اور ممنوع تھا۔ اور اس طرح ایک جانب فکری واخلاقی آوارگی کے جال' اور دوسری جانب سودی معیشت کے چنگل میں پھنسا کر یہود نے یورپ کے عیسائی معاشرے پر اپنی وہ گرفت مضبوط کرلی جو رفتہ رفتہ شدید سے شدید تر ہو کر بالآخر آج اس صورت میں موجود ہے کہ پورے عالم عیسائیت پر فیصلہ کن غلبہ ''واسپ'' (White Anglo Saxon Protestants) کا ہے' جن کے مضبوط ترین گڑھ انگلستان اور امریکہ ہیں...... اور خود اُن کے سر پر سوار ہے صیہونیت کی بدنامِ زمانہ یہودی تحریک۔ چنانچہ یہ اسی کا نمایاں ترین مظہر ہے کہ دو ہزار سال سے قائم شدہ عقیدے کے برعکس چند سال قبل پاپائے روم نے ایک خصوصی حکم نامے کے ذریعے یہودیوں کو حضرت مسیح علیہ السلام کے قتل کے الزام سے بری کر دیا...... ع ''کہ ہم نے انقلابِ چرخِ گرداں یوں بھی دیکھے ہیں!'' واقعہ یہ ہے کہ ''جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے!'' کی اس سے زیادہ نمایاں مثال دنیا کی پوری تاریخ میں شاید ہی کبھی سامنے آئی ہو!

(۱۲/مئی ۱۹۹۳ء)

باب ھفتم

”آنے والے دَور“ کی ایک واضح تصویر

علامہ اقبال نبوت تو درکنار، ولایت تک کے مدعی نہیں تھے۔(ع ”میں نہ عارف، نہ مجدد، نہ محدث، نہ فقیہہ!“) گویا وہ صرف ایک نابغہ انسان تھے۔اس کے باوجود ایک جانب ع ”گاہ مری نگاہِ تیز چیر گئی دلِ وجود!“ کے مصداق ان کی ژرف نگاہی اور حقیقت بینی کا عالَم یہ تھا کہ انہوں نے تقریباً پون صدی قبل اس حقیقت کا مشاہدہ کہ ع ”فرنگ کی رگِ جاں پنجۂ یہود میں ہے!“ بچشم قلب کر لیا تھا جو آج پوری دنیا کو بچشم سر نظر آ رہی ہے، اور دوسری جانب وہ ایک وِژنری بھی تھے اور اپنے مستقبل کے وِژن پر انہیں جو اعتماد اور یقین حاصل تھا وہ ان کے ان اشعار سے عیاں ہے کہ: ؎

کھول کر آنکھیں مرے آئینۂ افکار میں
آنے والے دَور کی دھندلی سی اک تصویر دیکھ!

اور: ؎

پردہ اٹھا دوں اگر چہرۂ افکار سے
لا نہ سکے گا فرنگ میری نواؤں کی تاب!

مزید برآں اپنی اس مستقبل اندیشی اور ”عاقبت بینی“ میں انہیں جس قدر جذب اور انہماک حاصل تھا وہ ان کے اس شعر سے ظاہر ہوتا ہے جو انہوں نے ہسپانیہ میں دریائے وادی الکبیر کے کنارے واقع جامع قرطبہ میں کہا تھا، یعنی: ؎

آبِ روانِ کبیر تیرے کنارے کوئی
دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کے خواب!

اور ان کی اس ”دُور بینی“ نے انہیں ”آنے والے دَور“ کے جو منظر دکھائے اس پر خود اپنی

حیرت اور استعجاب کا اظہار انہوں نے یوں کیا کہ:

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں
محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی!

تو جب ایک غیر نبی نابغہ انسان کا عالم یہ ہے تو اس پر قیاس کرتے ہوئے غور کیجیے کہ انبیاءِ کرام علیہم السلام کو اللہ تعالیٰ ﴿مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ (الانعام:۷۵) کے جو مشاہدات کراتا رہا ہے' اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ﴿بِمَآ اَرٰكَ اللّٰهُ﴾ (النساء:۱۰۵) اور ﴿اَرَيْنٰكَ﴾ (بنی اسرائیل:۶۰) کا جو معاملہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہا اس کی بنا پر جو پیشین گوئیاں آپؐ نے مستقبل کے حوادث و واقعات کے ضمن میں کی ہیں ان کے حتمی اور قطعی ہونے میں کسی شک کا کوئی امکان کسی مدعیٔ ایمان کے لیے کیسے ممکن ہے؟ لیکن افسوس کہ عہدِ حاضر میں مادّیت اور مادّہ پرستی کی جو ہوائیں چلیں اور ان کے باعث جو نظریاتی اور اعتقادی فتنے خود مسلمانوں میں پروان چڑھے ان کے زیر اثر جدید تعلیم یافتہ نسل کا ایک معتد بہ حصہ ان پیشین گوئیوں کو توجہ اور اعتناء کے لائق نہیں سمجھتا' اور اس ''مفتونیت'' کی شدت کا عالم یہ ہے کہ اب بھی جب کہ وہ حوادث و واقعات جن کی خبر دی گئی تھی' نوشتۂ دیوار کے مانند نگاہوں کے سامنے آ چکے ہیں' ان کو تسلیم کرنے سے اعراض ہی کی روش پر اصرار کیا جا رہا ہے۔

مستقبل میں پیش آنے والے واقعات میں سے سب سے یقینی اور قطعی معاملہ تو اس دنیا کے خاتمے یعنی قیامِ قیامت کا ہے' جسے قرآن حکیم اَلسَّاعَةُ' اَلْوَاقِعَةُ' القَارِعَة اور الحَاقّة ایسے ناموں سے موسوم کرتا ہے' اور جس کا کسی نہ کسی انداز میں ذکر قرآن مجید کے ہر صفحے پر موجود ہے۔ چنانچہ اس کی تصدیق تو اسلام اور ایمان کے بنیادی لوازم میں شامل ہے۔ تاہم اب سے تقریباً سوا سو برس قبل جو نئی ''سائنٹیفک عقلیت'' عالم اسلام پر حملہ آور ہوئی تھی' جس کی اساس نیوٹن کی فزکس پر تھی' اس نے قیامِ قیامت کو بھی موہوم اور مشکوک بنا دیا تھا۔ اس لیے کہ اُس دَور کی فزکس کے مطابق مادہ حقیقی بھی تھا اور دائمی و غیر فانی بھی' چنانچہ یہ تصور عام تھا کہ کائنات ہمیشہ سے قائم ہے اور ہمیشہ باقی رہے گی۔ یہ تو بھلا ہو آئن

سٹائن اوراس کے بعد کے علماءِ طبیعیات کا جن کے انقلاب آفریں انکشافات کے نتیجے میں مادہ بھی تحلیل ہو کر صرف انرجی کی صورت اختیار کر گیا اور کائنات کے بارے میں بھی یہ حقائق تسلیم کر لیے گئے کہ یہ ایک خاص لمحے میں ایک ''عظیم دھماکے'' (Big Bang) کے نتیجے میں وجود میں آئی تھی (جو گویا اللہ تعالیٰ کے امر ''کن'' کی تعبیر ہے) اور ایک پھلجھڑی کے مانند چکر لگاتی ہوئی مسلسل کھل اور پھیل رہی ہے' اور ایک خاص مدت کے بعد واپس برعکس سمت میں چکر لگاتی ہوئی تنگ ہوتے ہوئے بالآخر ایک نقطہ کی صورت اختیار کر لے گی' جیسے کہ متعدد کہکشائیں پہلے ہی ''سیاہ سوراخوں'' (Black Holes) کی صورت اختیار کر چکی ہیں۔ چنانچہ چند ہی سال قبل ایک پاکستانی ماہر طبیعیات چوہدری بشیر الدین نے ایک کتاب بھی طبیعیاتِ قیامت کے موضوع پر "Mechanics of the Doomsday" کے نام سے تصنیف کر دی ہے (شائع کردہ: ''ہولی قرآن ریسرچ فاؤنڈیشن'' ٦٠۔بی ناظم الدین روڈ' اسلام آباد)' جس میں واضح کر دیا ہے کہ پوری کائنات کی بڑی اور آخری قیامت سے قبل' جو ہوسکتا ہے کہ ابھی کافی دور ہو' اس کے جس حصے میں ہماری زمین واقع ہوئی ہے اس کی چھوٹی اور محدود قیامت واقع ہوسکتی ہے اور کوئی عجب نہیں کہ وہ قریب ہی ہو۔ (جگر مراد آبادی نے تو نمعلوم کس کیفیت میں یہ شعر کہا تھا:

اربابِ ستم کی خدمت میں اتنی ہی گزارش ہے میری
دنیا سے قیامت دُور سہی' دُنیا کی قیامت دُور نہیں!

لیکن اس میں ہوسکتا ہے کہ کچھ ''توارد'' متذکرہ بالا نظریے کے ساتھ بھی ہو گیا ہو۔)

بہرحال ایمان کے نقطۂ نظر سے تو اصل اہمیت قیامت کے قُرب یا بُعد اور اس کی ''مکینکس'' اور جزوی یا کلی ہونے کی نہیں اس کے ''یقینی'' ہونے کی ہے' اور انسان کی فوز و فلاح کے نقطۂ نظر سے اس سے بھی زیادہ اہمیت کا معاملہ ''بعث بعد الموت'' یعنی موت کے بعد دوبارہ جی اٹھنے اور جزا و سزا پر یقین کا ہے۔ اسی طرح ہماری اس وقت کی بحث اور گفتگو کے اعتبار سے اصل اہمیت اس امر کی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے قیامت کی جو علامات بتائی ہیں ان کے اعتبار سے اب یہ معاملہ زیادہ دیر اور دور کا نظر نہیں آتا۔ چنانچہ سب سے پہلے تو

آپؐ نے خود اپنی بعثت کو قربِ قیامت کی علامت قرار دیا' اس لیے کہ آپؐ اللہ کے آخری نبی اور رسول ہیں اور آپ ﷺ کے بعد اب کسی نبی یا رسول کو نہیں' قیامت ہی کو آنا ہے۔ چنانچہ بخاریؒ اور مسلمؒ دونوں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے اپنی دونوں انگلیوں کو جوڑ کر فرمایا: ''میری بعثت اور قیامت آپس میں ایسے ملی ہوئی ہیں جیسے یہ دونوں انگلیاں!'' اور اس سے بھی زیادہ واضح الفاظ میں آپ ﷺ نے یہی بات ان الفاظ میں فرمائی جو ترمذیؒ نے مستورد بن شداد رضی اللہ عنہ سے روایت کیے ہیں' یعنی: ''میں تو گویا عین قیامت ہی میں مبعوث کیا گیا ہوں' اور میں نے اس سے صرف اتنی ہی سبقت کی ہے جتنی درمیانی انگلی انگشت شہادت سے بڑھی ہوئی ہوتی ہے'' —— اور سر دست ان خالص معجزانہ اور خرقِ عادت واقعات سے قطع نظر جو عین وقوعِ قیامت سے متصلاً قبل پیش آئیں گے' قربِ قیامت کی بعض اہم علامات کا تعلق صحرائے عرب اور اس کے بادیہ نشینوں کی اس حیرت ناک خوشحالی سے ہے جو آج سے سو سال قبل کسی کے وہم و گمان میں بھی آنی ممکن نہیں تھی۔

چنانچہ (۱) اس ''حدیث جبرائیلؑ'' میں جو ''اُمُّ السُّنَّة'' یعنی حدیث رسول ﷺ کے ذخیرے میں اسی مقام و مرتبے کی حامل قرار دی جاتی ہے جو قرآن حکیم میں سورۃ الفاتحہ کا ہے' اور جو صحیح بخاریؒ اور صحیح مسلمؒ کے علاوہ جملہ کتب حدیث میں متعدد جلیل القدر صحابہ رضی اللہ عنہم سے مروی ہے' قربِ قیامت کی ایک اہم علامت ان الفاظ میں بیان ہوئی ہے کہ: ''تم دیکھو کہ وہ مفلوک الحال چرواہے جو کبھی ننگے پیر اور ننگے بدن ہوا کرتے تھے' عالی شان عمارتوں کی بلندی میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کر رہے ہوں!'' (۲) امام مسلمؒ نے جو حدیث حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے اس میں قربِ قیامت کی علامت ان الفاظ میں وارد ہوئی ہے کہ: ''دولت اتنی کثیر اور عام ہو جائے گی کہ ایک شخص اپنی زکوٰۃ نکالے گا لیکن اس کا قبول کرنے والا کوئی نہ ہو گا (سعودی عرب' کویت اور متحدہ عرب امارات کے مقامی باشندوں کی حد تک یہ صورت حال فی الواقع پیدا ہو چکی ہے) اور عرب کی زمین سبزہ زاروں اور چشموں کا منظر پیش کرنے لگے گی!'' اور (۳) سب سے

بڑھ کر وہ حدیث جو امام مسلمؒ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے روایت کی ہے' جس کی رُو سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''قیامت قائم نہیں ہوگی جب تک فرات سے سونے کا ایک پہاڑ برآمد نہ ہو جائے جس پر لوگ ایک دوسرے سے جنگ کریں گے' یہاں تک کہ ننانوے فیصد لوگ مارے جائیں گے۔''

ان میں سے جہاں تک پہلی دو حدیثوں کا تعلق ہے ان کے بارے میں کچھ عرض کرنے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں ہے' اس لیے کہ وہ تو خود ہی ''آفتاب آمد دلیل آفتاب'' کی مصداقِ کامل ہیں' البتہ تیسری حدیث پر غور کے ضمن میں یہ چند امور پیش نظر رکھنے ضروری ہیں: (i) قدیم زمانے میں ملکوں کو دریاؤں کے نام سے موسوم کرنے کا رواج تھا' چنانچہ یہاں فرات سے مراد عراق اور کویت ہیں۔ (ii) آج کے صنعتی دَور میں سب سے زیادہ قیمتی متاع تیل ہے' جسے بجا طور پر ''سیال سونا'' کہا جاتا ہے۔ (iii) کوئی عجب نہیں کہ تیل کے وہ زیر زمین اور زیر سمندر سوتے بھی' جن سے سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات تیل نکال رہے ہیں' وادیٔ فرات ہی کی جانب سے آتے ہوں۔ (iv) اس تیل کی دولت پر جو ''جنگ عظیم'' شروع ہوئی ہے دو سال قبل کی خلیج کی جنگ کو اس کے صرف نقطۂ آغاز کی حیثیت حاصل ہے۔ چنانچہ یاد ہوگا کہ اسے صدام حسین نے ''اُمُّ الـمَحَارِب'' یعنی جنگوں کی ماں قرار دیا تھا۔ اور (v) اس چند روزہ ''نقطۂ آغاز'' کے دوران جو ناقابل تصور حد تک وحشیانہ بمباری عراق پر ہوئی تھی اس کے پیش نظر کون سے تعجب کی بات ہے کہ اگر جنگوں کا یہ سلسلہ آگے بڑھے تو عراق اور کویت کی تباہی اسی درجہ کی ہو جائے جو اِس حدیث میں بیان ہوا ہے۔ ؏ ''حذر اے چیرہ دستاں' سخت ہیں فطرت کی تعزیریں!''

الغرض' راقم کو اگرچہ ان نجومیوں کی پیشین گوئیوں اور ماہرین فلکیات کی دی ہوئی خبروں سے تو کوئی دلچسپی نہیں ہے جو دنیا کے خاتمے کو صرف قریب ہی نہیں قرار دے رہے ہیں بلکہ اس کا وقت بھی معین کر رہے ہیں (اگرچہ ''قرائن کی شہادت'' کے درجے میں وہ بھی قابل اعتناء ہیں!) لیکن ان احادیث نبویہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی بنا پر' جن میں سے چند کا حوالہ اوپر دیا گیا' راقم کو یہ یقین حاصل ہے کہ دنیا نہایت تیز رفتاری کے ساتھ (گویا ؏

''دوڑ و زمانہ چال قیامت کی چل گیا!'' کے سے انداز میں) اپنے خاتمے کی جانب بڑھ رہی ہے۔ لطف یہ ہے کہ زمانہ اور وقت اور واقعات وحوادث کی اس تیز رفتاری کا نقشہ بھی ایک حدیث میں نہایت خوبصورت استعاراتی زبان میں کھینچ دیا گیا ہے' جسے امام ترمذیؒ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے' جس کی رو سے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''قیامت قائم نہیں ہوگی جب تک زمانہ مختصر نہ ہو جائے' جس کے نتیجے میں سال مہینے کے برابر نظر آنے لگے' مہینہ جمعہ (تا جمعہ یعنی ایک ہفتہ) محسوس ہونے لگے' جمعہ (یعنی ہفتہ) ایک دن کی طرح ہو جائے' دن ایک گھنٹے کے برابر محسوس ہو اور ایک گھنٹہ آگ کے ایک شعلے کی بھڑک کے مانند مختصر ہو جائے!''

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے' وقوعِ قیامت تو چونکہ قرآن مجید کا سب سے زیادہ کثیر الذکر موضوع ہے' لٰہذا اس سے تو کسی مسلمان کو مجالِ انکار ہو ہی نہیں سکتی' قربِ قیامت کی ان علامات سے بھی جو متذکرہ بالا احادیث میں بیان ہوئی ہیں' شاید ہی کوئی مسلمان اختلاف کرے' اِلّا یہ کہ ان کے بعض الفاظ کی تعبیر و تاویل میں کسی جزوی اختلاف کی گنجائش ہو۔ اسی طرح عین وقوعِ قیامت کے وقت جن واقعات وحوادث کی خبر احادیث میں دی گئی ہے وہ بھی جدید سائنسی نظریات کے پیشِ نظر کچھ ایسے مستبعد اور ''اَن ہونے'' نظر نہیں آتے' جیسے مثلاً سورج کا مغرب سے طلوع ہونا' یا زمین کا تین مقامات پر ''حسف'' یعنی بری طرح دھنس جانا' یا بہت عظیم آگ' یا بے پناہ دھواں! اس لیے کہ جدید طبیعیات کے نزدیک جس طرح اِس وقت کل کائنات ایک عظیم پھلجھڑی کے مانند اپنے محور پر تیزی کے ساتھ گردش کرتے ہوئے کھلتی اور پھیلتی جا رہی ہے' اسی طرح ایک وقت آئے گا کہ وہ برعکس رُخ پر چکر کھاتی ہوئی سکڑتی اور سمٹتی چلی جائے گی' تو یہ کیا بعید ہے کہ اس بڑی قیامت سے قبل کی چھوٹی قیامت کے موقع پر نظامِ شمسی میں وہ اختلال پیدا ہو جائے اور زمین کی گردش ع ''لوٹ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو!'' کے انداز میں مغرب سے مشرق کی بجائے مشرق سے مغرب کی جانب ہو جائے' جس کے نتیجے میں سورج مغرب سے طلوع ہونے لگے۔ مزید برآں' جیسے کہ سورۃ القیامۃ کی آیات ۸ اور ۹ میں وارد ہوا ہے' چاند اور سورج

یکجا ہو جائیں(۱) اور چاند سورج میں دھنس جائے اور خود زمین پر بھی اتنے بڑے بڑے شہاب گریں کہ وہ تین جگہ سے بری طرح دھنس جائے اور اس دھنسنے کے باعث اس کے اندر کی گیس اور آگ کا طوفان ابل پڑے۔

البتہ درمیانی عرصہ کے چار عظیم واقعات کے بارے میں مسلمانوں کے جدید تعلیم یافتہ طبقے کا تو ایک معتد بہ حصہ شکوک وشبہات میں مبتلا ہے ہی' بہت سے ایسے علماء ومفسرین بھی مذبذب اور متردّد ہیں جو عہدِ حاضر (بلکہ صحیح تر الفاظ میں ماضی قریب) کی نیوٹن کی سائنس پر مبنی ''عقلیت پرستی'' کا شکار ہو گئے۔ ان چار عظیم واقعات کی جانب اشارات تو اگرچہ قرآن مجید میں بھی موجود ہیں لیکن ان کی تفصیلی خبریں اور پیشین گوئیاں ان احادیث نبویہؐ میں وارد ہوئی ہیں جو کتاب الفتن کے مختلف ابواب میں شامل ہیں۔ ان عظیم واقعات کے مابین زمانی ترتیب یہ ہے: (۱) سب سے پہلے ''اَلْمَلْحَمَۃُ الْکُبْرٰی ''یعنی تاریخ انسانی کی ''عظیم ترین جنگ'' جس کی جانب اشارہ سورۃ الکہف کی دوسری آیت میں ﴿بَاْسًا شَدِیْدًا﴾ کے الفاظ میں وارد ہوا ہے' لیکن جس کی تفاصیل کتبِ حدیث کے ''باب الملاحم'' میں بیان ہوئی ہیں۔ (۲) ''المسیح الدَّجّال'' کا خروج اور اس کے ہاتھوں مشرقِ وسطٰی کے مسلمانوں کی عظیم تباہی یا بالفاظِ دیگر اس کے ذریعے ''اُمّیین'' پر اللہ کے عذاب کے دورِ ثانی کی تکمیل۔ (۳) حضرت عیسیٰ ابن مریم علیہما السلام کا نزول اور ان کے ہاتھوں دجال کا قتل اور یہودیوں کا آخری قلع قمع' یا بالفاظِ دیگر اللہ کا عذابِ استیصال' چنانچہ جہاں تک نزولِ عیسٰیؑ کا تعلق ہے اس کا بھی واضح اشارہ سورۃ الزخرف کی آیت ۶۰ میں ان الفاظ میں موجود ہے کہ ﴿وَاِنَّہٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَۃِ﴾ ''اور وہ (یعنی عیسیٰؑ) ایک نشانی ہیں قیامت کی!'' اور بالآخر (۴) اسلام کا عالمی غلبہ اور پورے کرۂ ارضی پر خلافت علٰی منہاج النبوۃ کے نظام کا قیام!

۱۷رمئی ۱۹۹۳ء

(۱) ﴿وَخَسَفَ الْقَمَرُ ۝۸ وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ۝۹﴾ (القیٰمۃ)
ترجمہ: ''اور چاند بے نور ہو جائے گا۔ اور سورج اور چاند یکجا ہو جائیں گے''۔

باب ھشتم

اسلام کا عالمی غلبہ' یا عالمی نظامِ خلافت کا قیام

قیامت سے قبل کے چار عظیم واقعات میں سے جہاں تک آخری یعنی اسلام کے عالمی غلبے کا تعلق ہے' اگرچہ اس کی کوئی قطعی نص تو کم از کم راقم کے علم کی حد تک قرآن حکیم میں موجود نہیں ہے' تاہم منطق کے اس قضیے کے صغریٰ اور کبریٰ دونوں قرآن مجید میں بتکرار واعادہ وارد ہوئے ہیں' جس کا لازمی نتیجہ دین حق کا عالمی غلبہ ہے۔ چنانچہ تین بار قرآن حکیم میں یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں کہ: ﴿هُوَ الَّذِیْۤ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ﴾ (التوبۃ:۳۳' الفتح:۲۸' الصّف:۹) یعنی ''وہی ہے (اللہ) جس نے بھیجا اپنے رسول (محمد ﷺ) کو الہدیٰ (قرآن حکیم) اور دین حق (اسلام) دے کر تاکہ غالب کر دے اسے کل کے کل دین (نظامِ زندگی) پر!'' اور دو مرتبہ ذرا سے لفظی فرق کے ساتھ (التوبۃ:۳۲' الصّف:۸) یہ الفاظ بھی وارد ہوئے کہ: ''یہ لوگ (اور یہاں اصلاً مراد یہود ہیں' اس لیے کہ دونوں مقامات پر متصلاً قبل یہود ہی کا ذکر ہے) چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو اپنے مونہوں (کی پھونکوں) سے بجھا دیں جب کہ اللہ اپنے نور کو لازماً مکمل فرما کر رہے گا' خواہ یہ ان کافروں کو کتنا ہی ناگوار ہو!'' گویا ان پانچ آیات پر مشتمل تو صغریٰ ہے' اور کبریٰ یہ ہے کہ آنحضور ﷺ کی بعثت پوری نوعِ انسانی اور کل عالم انسانیت کی جانب ہے' اور حسن اتفاق سے یہ مضمون بھی قرآن حکیم میں قدرے مختلف الفاظ میں پانچ ہی بار وارد ہوا ہے۔ یعنی: (۱) ''ہم نے نہیں بھیجا ہے (اے نبی ﷺ!) آپؐ کو مگر تمام انسانوں کے لیے بشیر اور نذیر بنا کر!''[۱] (۲) ''ہم نے نہیں بھیجا ہے آپؐ کو مگر تمام جہان والوں کے

---

(۱) ﴿وَمَاۤ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّ نَذِیْرًا﴾ (سبا:۲۸)

لیے رحمت بنا کر!‘‘[2] (۳) ’’بڑی بابرکت ہے وہ ہستی جس نے اپنے بندے پر الفرقان نازل فرمایا تا کہ وہ تمام جہان والوں کو خبردار کرنے والا بن جائے!‘‘[3] (۴) سورۃ الجمعہ کی آیات ۲ اور ۳ میں فرمایا کہ آپؐ کی بعثت صرف ’’اُمّیّین‘‘ یعنی عربوں ہی کے لیے نہیں ’’آخرین‘‘ یعنی دوسروں کے لیے بھی ہے! اور (۵) سورۃ الاعراف کی آیت ۱۵۸ میں آپؐ کو حکم دیا گیا: ’’کہہ دیجیے کہ لوگو! میں تم سب کی جانب اللہ کا رسول ہوں!‘‘[4] —— اب صغریٰ اور کبریٰ کو جمع کر لیجیے تو یہ لازمی منطقی نتیجہ برآمد ہوجاتا ہے کہ آپؐ کی بعثت کا مقصد بتمام وکمال اُسی وقت پورا ہوگا جب پورے عالم انسانی یعنی کل روئے ارضی پر آپ ﷺ کے لائے ہوئے دین کا حتمی غلبہ ہوجائے گا۔ گویا بقول اقبال:

وقتِ فرصت ہے کہاں کام ابھی باقی ہے
نورِ توحید کا اِتمام ابھی باقی ہے!

رہیں احادیث نبویہؐ تو ان میں تو یہ خبر نہایت وضاحت اور صراحت کے ساتھ دی گئی ہے کہ ایسا ہو کر رہے گا۔ چنانچہ ان میں سے ایک حدیث مبارک تو وہ ہے جس کی رُو سے دنیا میں وہ نظام ایک بار پھر قائم ہو کر رہے گا جو نبی اکرم ﷺ کے زمانے میں قائم ہوا تھا اور آپؐ کے انتقال کے بعد بھی کم از کم تیس برس تک اپنی کامل اور آئیڈیل صورت میں برقرار رہا۔ اسے امام احمد بن حنبلؒ نے حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے اور اس کے مطابق آنحضور ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے مخاطب ہو کر فرمایا: ’’تمہارے مابین نبوت موجود رہے گی (آپؐ کا اشارہ خود اپنی ذاتِ اقدس کی جانب تھا) جب تک اللہ چاہے گا‘ پھر جب اللہ چاہے گا اسے اٹھا لے گا۔ اس کے بعد نبوت کے طریقے پر خلافت قائم ہوگی اور یہ بھی رہے گی جب تک اللہ چاہے گا کہ قائم رہے‘ پھر جب اللہ چاہے گا اسے بھی اٹھا لے گا۔ پھر کاٹ کھانے والی (یعنی ظالم) ملوکیت آئے گی اور وہ بھی رہے گی جب تک اللہ چاہے گا‘ پھر

(۲) ﴿وَمَآ اَرۡسَلۡنٰکَ اِلَّا رَحۡمَۃً لِّلۡعٰلَمِیۡنَ﴿۱۰۷﴾﴾ (الانبیاء)
(۳) ﴿تَبٰرَکَ الَّذِیۡ نَزَّلَ الۡفُرۡقَانَ عَلٰی عَبۡدِہٖ لِیَکُوۡنَ لِلۡعٰلَمِیۡنَ نَذِیۡرًا ۙ﴿۱﴾﴾ (الفرقان)
(۴) ﴿قُلۡ یٰۤاَیُّہَا النَّاسُ اِنِّیۡ رَسُوۡلُ اللّٰہِ اِلَیۡکُمۡ جَمِیۡعًا﴾ (الاعراف: ۱۵۸)

جب اللہ چاہے گا اسے بھی اٹھا لے گا۔ پھر مجبوری کی ملوکیت (غالباً مراد ہے مغربی استعمار کی غلامی) کا دور آئے گا اور وہ بھی رہے گا جب تک اللہ چاہے گا' پھر جب اللہ چاہے گا اسے بھی اٹھا لے گا ـــــ اور پھر دوبارہ نبوت کے طریق پر خلافت قائم ہوگی!'' راوی کے قول کے مطابق اس کے بعد آپؐ نے خاموشی اختیار فرمالی۔ (اور آپؐ کی یہ خاموشی بھی بلاسبب نہ تھی' تاہم اس کا بیان بعد میں ہوگا)۔ اس حدیث کی ایک دوسری روایت میں صراحت ہے کہ جب وہ نظام دنیا میں دوبارہ قائم ہو جائے گا تو آسمان بھی اپنی ساری برکات نازل فرمادے گا اور زمین بھی اپنی تمام برکتیں باہر نکال کر رکھ دے گی۔ (چنانچہ بعض دوسری احادیث میں ان برکات کی تفصیلات بھی بیان ہوئی ہیں)

پھر دو نہایت اہم احادیث وہ ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ اب جو خلافت علیٰ منہاج النبوت کا نظام قائم ہوگا وہ پورے عالم انسانیت اور کل روئے ارضی کو محیط ہوگا۔ چنانچہ (۱) صحیح مسلمؒ میں حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ (جو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام تھے) سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اللہ نے میرے لیے پوری زمین کو سمیٹ یا سکیڑ دیا۔ چنانچہ میں نے اس کے سارے مشرق بھی دیکھ لیے اور تمام مغرب بھی' اور سن رکھو کہ میری اُمت کی حکومت ان تمام علاقوں پر قائم ہو کر رہے گی جو مجھے سکیڑ یا لپیٹ کر دکھا دیے گئے!'' اور (۲) مسند احمد بن حنبلؒ میں حضرت مقداد بن الاسود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کل روئے ارضی پر نہ کوئی اینٹ گارے کا بنا ہوا گھر باقی رہے گا نہ اونٹ کے بالوں کے کمبلوں سے بنا ہوا خیمہ جس میں اللہ کلمۂ اسلام کو داخل نہ کر دے' خواہ کسی عزت کے مستحق کے اعزاز کے ساتھ اور خواہ کسی مغلوب کی مغلوبیت کے ذریعے۔ یعنی یا تو اللہ انہیں عزت دے گا اور اہل اسلام میں شامل کر دے گا یا انہیں مغلوب کر دے گا' چنانچہ وہ اسلام کی بالادستی قبول کر لیں گے!'' حضرت مقداد رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس پر میں نے (اپنے دل میں) کہا کہ ''تب وہ بات پوری ہوگی (جو سورۃ الانفال کی آیت ۳۹ میں وارد ہوئی ہے) کہ دین کل کا کل اللہ ہی کے لیے ہو جائے!''

الغرض‘ قیامِ قیامت اور دنیا کے خاتمے سے قبل کل روئے ارضی پر وہ دورِ سعادت یقیناً آ کر رہے گا جس میں ”اللہ ایمان اور عمل صالح کی شرائط پوری کرنے والے مسلمانوں کو لازماً زمین کی خلافت اسی طرح عطا فرمائے گا جس طرح ان سے پہلے لوگوں کو (مثلاً حضرت داوٗد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام کو) عطا کی تھی‘ اور ان کے لیے ان کے اس دین کو زمین میں لازماً تمکن عطا فرما دے گا جسے اس نے ان کے لیے پسند فرما لیا ہے‘ اور ان کی خوف زدگی کی کیفیت کو لازماً امن وسکون کی حالت سے تبدیل کر دے گا!“[1] —— چنانچہ اسی کی کوئی جھلک دیکھ لی تھی عہد حاضر کے وِژنری‘ عبقری اور نابغہ انسان علامہ اقبال کی ”نگاہِ تیز“ نے‘ جب انہوں نے کہا تھا:

آسماں ہو گا سحر کے نور سے آئینہ پوش
اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی
پھر دلوں کو یاد آ جائے گا پیغامِ سجود
پھر جبیں خاکِ حرم سے آشنا ہو جائے گی
آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں
محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی
شب گریزاں ہو گی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہو گا نغمۂ توحید سے

اور اس میں بھی ہرگز کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ اس دورِ سعادت کی نوید ہندو دھرم کی کتابوں میں بھی موجود ہے‘ اس لیے کہ جیسے کہ اس سے قبل عرض کیا جا چکا ہے‘ دنیا کے تمام مذاہب اسلام ہی کی بدلی اور بگڑی ہوئی صورتیں ہیں اور ان سب میں مشکوٰۃِ نبوت کے انوار کا کچھ نہ کچھ حصہ موجود اور برقرار ہے۔ چنانچہ پنڈت شری رام اچاریہ اپنی تحریر شائع شدہ

---

(۱) ﴿وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مِنۡکُمۡ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسۡتَخۡلِفَنَّھُمۡ فِی الۡاَرۡضِ کَمَا اسۡتَخۡلَفَ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِھِمۡ ۪ وَلَیُمَکِّنَنَّ لَھُمۡ دِیۡنَھُمُ الَّذِی ارۡتَضٰی لَھُمۡ وَلَیُبَدِّلَنَّھُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ خَوۡفِھِمۡ اَمۡنًا ؕ﴾ (النور:۵۵)

''اکھنڈ جیوتی'' بابت مارچ ۱۹۸۱ء میں لکھتے ہیں: ''ایسے ثبوت موجود ہیں کہ یگ بدلنے کا وقت آ گیا ہے۔کل یگ (جسے عرفِ عام میں کلجگ کہہ دیا جاتا ہے) اب وداع ہو رہا ہے اوراس کی جگہ پر ایسا دور آ رہا ہے جسے ست یگ (یعنی سچا زمانہ یا برحق زمانہ) کہا جا سکے۔ منوسمرتی' لنگ پران اور بھاگوت میں دیے گئے اعداد وشمار کے مطابق حساب پھیلانے سے پتا چلتا ہے کہ موجودہ دور بحران کا دور ہے......ان سب اعداد وشمار کو دیکھتے ہوئے وہ وقت ٹھیک ان ہی دنوں میں ہے جس میں یُگ بدلنا چاہیے......یعنی ۱۹۸۰ء سے ۲۰۰۰ء تک بیس سال کا عرصہ۔'' (بحوالہ ''اگر اب بھی نہ جاگے تو......'' تالیف مولانا شمس نوید عثمانی' شائع کردہ روشنی پبلشنگ ہاؤس' بازار نصر اللہ خاں' رام پور۔ یو پی۔ بھارت)۔تو اس وقت اِس امر سے تو بحث نہیں ہے کہ پنڈت جی کا حساب کتاب صحیح ہے یا نہیں' لیکن اس میں بھی ہرگز کوئی شک نہیں ہے کہ دورِ سعادت کی یہ نوید اور خوشخبری قرآن حکیم کے اشارات (گویا دلالۃ النص) اور حدیث نبویؐ کی تصریحات (گویا عبارۃ النص) کے عین مطابق ہے۔

اس پر مزید اضافہ فرما لیجیے اس کا کہ حضرت مسیح علیہ السلام کی آمد ثانی' جو عیسائیوں کے جملہ فرقوں کا متفق علیہ عقیدہ ہے' زمین پر ''آسمانی بادشاہت'' اور ''خدائی عدالت'' کے قیام ہی کے لیے ہوگی۔ گویا ع ''متفق گردید رائے بوعلی با رائے من!'' کے مصداق اسلام کے نظامِ عدل وقسط یعنی خلافت علیٰ منہاج النبوت کا عالمی سطح پر قیام اپنوں اور بیگانوں سب کے نزدیک مسلّم ہے اور گویا تقدیر مبرم کی حیثیت رکھتا ہے۔

اس موقع پر اس امر کا تذکرہ بھی یقیناً مفید ہو گا کہ اپنی معرکۃ الآراء تصنیف ''آئیڈیالوجی آف دی فیوچر'' میں علامہ اقبال کے نظریۂ خودی کی خالص فلسفیانہ سطح پر مدلل ترین اور مبسوط ترین تشریح کرنے والے ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم نے قیامت سے قبل اسلام کے نظامِ عدل وقسط کے عالمی سطح پر قیام کو نظریۂ ارتقاء کا لازمی اور منطقی نتیجہ قرار دیا ہے۔ان کے نزدیک ارتقاء کی پہلی منزل خالص کیمیائی اور طبیعیاتی ارتقاء کی تھی جس کے نتیجے میں سادہ کیمیاوی عناصر نے ان پیچیدہ حیاتیاتی مرکبات کی صورت اختیار کی جن میں

حیات کا ظہور ممکن ہوا۔ اس کے بعد حیاتیاتی ارتقاء کا عمل شروع ہوا جو حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق پر اپنے مرتبۂ کمال کو پہنچ گیا۔ پھر ذہنی اور نفسیاتی ارتقاء کا سفر شروع ہوا جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ذات میں اپنے نقطۂ عروج کو پہنچ گیا۔ پھر سماجی اور تمدنی ارتقاء کا آغاز ہوا جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ مبارکہ اور آپ ؐ پر ''دینِ حق'' کی تکمیل اور سماجی اور تمدنی عدل وقسط کے نظام کے بالفعل قیام پر اپنے منتہائے کمال کو پہنچ گیا۔ اب ارتقاء کے اس طویل سفر کا صرف ایک ہی مرحلہ باقی ہے اور وہ ہے اس نظام کے عالمی سطح پر قیام کا —— اس کے بعد چونکہ موجودہ تخلیق جن اصول وقواعد اور حدود وقیود کے ساتھ ہوئی ہے ان میں ارتقاء کی کوئی اور جہت اور سمت ممکن نہیں ہے' لہٰذا اس کی بساط لپیٹ دی جائے گی اور اسی کا نام قیامت ہے۔ گویا قیامت سے قبل محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر کامل ہونے والے دینِ حق کا پورے عالم انسانی اور کل روئے ارضی پر غلبہ سفر ارتقاء کی وہ آخری اور لازمی منزل ہے جس کی جانب وہ کاروانِ انسانیت کشاں کشاں رواں ہے جس کے بارے میں علامہ اقبال نے بالکل بجا طور پر کہا تھا: ؎

یا ز نورِ مصطفیٰؐ اُو را بہاست
یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفیٰؐ ست!

البتہ ایک اور خبر جو بعض دوسری احادیث میں وارد ہوئی ہے' یہ ہے کہ ''ہر کمالے را زوالے'' کے مطابق اس دورِ سعادت کے بعد بھی ایک ایسا دور آئے گا جس میں پوری زمین پر ایک انسان بھی اللہ اللہ کہنے والا باقی نہیں رہے گا (مسلمؒ عن انس رضی اللہ عنہ) اور دنیا میں صرف ''بدترین خلائق'' ہی رہ جائیں گے (مسلمؒ عن عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ)۔ چنانچہ قیامت ان ہی پر قائم ہو گی۔ یہ غالباً اس لیے ہو گا کہ صاحب ایمان اور نیک بندوں کو قیامت کی ہولناکیوں اور سختیوں سے بچا لیا جائے۔ صحیح مسلمؒ ہی میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے اس مضمون کی احادیث مروی ہیں کہ جب خلافت علیٰ منہاج النبوت کا وہ دورِ سعادت جتنا عرصہ اللہ چاہے گا قائم رہ چکے گا تو دفعۃً ایک پاک اور ٹھنڈی ہوا ایسی

چلے گی جس سے ہر وہ شخص موت کی نیند سو جائے گا جس کے دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان ہوگا...... چنانچہ اس کے بعد دنیا میں صرف بے ایمان اور بدکار لوگ ہی باقی رہ جائیں گے‘ اور وہی جہنم کے اُخروی عذاب سے قبل ہولناک زلزلۂ قیامت(۱) کی سختیاں بھی جھیلیں گے! ــــــ اور یہی سبب معلوم ہوتا ہے اس سکوت اور توقف کا جو حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کی روایت کے مطابق آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسری بار ’’خلافت علیٰ منہاج النبوت‘‘ کے قیام کی نوید کے بعد اختیار فرمایا تھا۔ یعنی اس دورِ سعادت کے تذکرے کے فوراً بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دورِ نحوست کا ذکر مناسب نہیں خیال فرمایا۔ واللہ اعلم!

اب جہاں تک ان عظیم حوادث و واقعات کا تعلق ہے جو اسلام کے عالمی غلبہ سے قبل پیش آنے والے ہیں‘ یعنی ایک عظیم‘ نہایت ہولناک اور تباہ کن جنگ‘ دجال کا خروج‘ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول اور اُن کے ہاتھوں دجال کا قتل اور یہودیوں کا استیصال‘ جن کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے‘ اور ان کے علاوہ‘ بلکہ ان ہی کے ذیل میں یاجوج و ماجوج کا سیلاب‘ بیعت مہدیؒ اور ’’دَابَّۃ الاَرض‘‘ کا ظہور وغیرہ‘ تو واقعہ یہ ہے کہ جدید تعلیم یافتہ مسلمانوں کی اکثریت تو ان کا ذکر بھی پسند نہیں کرتی۔ رہے علماء دین تو ظاہر ہے کہ ان میں سے کسی کے لیے ان کا انکار تو ممکن نہیں ہے‘ تاہم ماضی قریب کے بعض نامور علماء اور مفسرین بھی ان کے بارے میں کم از کم مذبذب اور متردّد ضرور رہے ہیں‘ اور موجودہ علماء میں سے بھی بہت سے ان کی عقلی اور سائنسی توجیہہ یا استعاراتی تأویل کی جانب رجحان رکھتے ہیں۔

اس صورت حال کے بعض اسباب تو عمومی ہیں اور بعض خصوصی۔ عمومی اسباب میں سے چند یہ ہیں:

۱) اگرچہ خالص سائنس کی دنیا میں تو نیوٹن کی طبیعیات کا دَور ختم ہو چکا ہے‘ لیکن عوامی سطح پر یورپ اور امریکہ تک میں تاحال اسی کے جامد نظریات و تصورات کا سکہ رواں ہے‘ لہٰذا عام طبعی قوانین کے خلاف کسی بات کو تسلیم کرنے کے لیے ذہن بالعموم

---

(۱) ﴿اِنَّ زَلْزَلَۃَ السَّاعَۃِ شَیْءٌ عَظِیْمٌ﴾ (الحج)

تیار نہیں ہیں۔ (گزشتہ سال مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور نے اپنے سالانہ محاضراتِ قرآنی کے لیے انگلستان کے نومسلم سکالر جناب عبدالحکیم کو دعوت دی تھی جو حکمت تبلیغ کے تحت مغرب میں اپنا سابق نام گائی ایٹن ہی استعمال کرتے ہیں' اور انہوں نے بھی اپنے ایک خطبے میں اسی بات کی گواہی دی تھی کہ یورپ اور امریکہ کے اکثر لوگ تا حال ذہنی اعتبار سے نیوٹونین فزکس ہی کے دور میں جی رہے ہیں۔)

۲) عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ اس قسم کی باتوں پر توجہ سے جذبۂ عمل کمزور پڑ جاتا ہے' اور ذہنی اور نفسیاتی طور پر لوگ کسی ''مَرد ے از غیب'' کے انتظار کی کیفیت میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اور یہ بات خام اور نیم پختہ اذہان کے اعتبار سے درست بھی ہے!

۳) اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان ہی چیزوں کا سہارا لے کر اُمت کی تاریخ کے دوران مختلف مواقع پر شہرت وعزت اور نام ونمود کے خواہاں حوصلہ مند لوگ مختلف دعوے کر کے عوام کے دین وایمان کے لیے فتنہ کا سامان فراہم کرتے رہے ہیں' اور کون کہہ سکتا ہے کہ تاریخی اعتبار سے یہ بات درست نہیں!

ان پر مستزاد ہیں وہ دو خصوصی اسباب جن کا تعلق ان دو فتنوں سے ہے جو گزشتہ صدی کے اواخر میں سائنسی عقلیت کے دور کے آغاز کے ساتھ ہی پیدا ہوئے اور تا حال پروان چڑھ رہے ہیں۔ یعنی (۱) فتنۂ قادیانیت اور (۲) فتنۂ استخفاف وانکارِ حدیث۔ ان میں سے مؤخر الذکر نے جدید تعلیم یافتہ لوگوں کی اکثریت کے ذہنوں میں حدیث نبویؐ کی وقعت واہمیت کو کم کر دیا ہے۔ چنانچہ جن لوگوں کے اَذہان اس فتنے سے زیادہ مسموم ہیں وہ تو حدیث نبویؐ کی حجیت کا صریح انکار کر دیتے ہیں' باقی بھی عملاً اس کی جانب سے ''غضِ بصر'' اور صرفِ نظر کی روش اختیار کیے ہوئے ہیں۔ رہا مقدم الذکر فتنہ تو اس کے بانی اور مؤسس نے تو اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ غضب ڈھایا کہ نہ صرف خود مجدّد اور مہدی ہونے کا دعویٰ کر دیا' بلکہ ؎

''آنے والے سے مسیح ناصری مقصود ہے
یا مجدد جس میں ہوں فرزند مریم کی صفات!''

کی بحث چھیڑ کر اور پھر خود ہی کو مثیلِ مسیحؑ اور مسیح موعودؑ قرار دے کر نزولِ مسیحؑ کا باب ہی بند کر دیا (جس کے لیے ''رفعِ مسیحؑ'' کا انکار بھی لامحالہ ضروری تھا!)

لیکن اس حقیقت سے قطع نظر کہ ان واقعات وحوادث کے سلسلے کی پہلی کڑی، یعنی ایسی ہولناک اور تباہ کن جنگ جس کا میدان مشرقِ وسطیٰ کے عرب ممالک بنیں گے، اب بالکل نوشتۂ دیوار کے مانند سامنے کی بات ہے، اور ساتھ ہی اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے کہ جہاں تک ان واقعات وحوادث کی ان تفاصیل کا تعلق ہے جو احادیث میں وارد ہوئی ہیں، ان میں یقیناً استعاراتی زبان بھی استعمال ہوئی ہے۔ اس لیے کہ اب سے چودہ سو برس قبل آج کے سلاحِ جنگ اور ذرائع رسل ورسائل کا بیان اسی طور سے ممکن تھا، اور مختلف راویوں کی روایات میں لفظی فرق اور زمانی ترتیب کا گڈمڈ ہو جانا بھی عین قرین قیاس ہے۔ جہاں تک ان کے مجموعی خاکے کا تعلق ہے، راقم اپنے مطالعہ اور فہم القرآن کی بنا پر پورے انشراحِ صدر کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ وہ قرآن کے فلسفہ وحکمت کے ساتھ پوری طرح ہم آہنگ اور بالخصوص قرآن کے اس قانونِ عذاب کے عین مطابق ہے جو صفحاتِ گزشتہ میں بیان ہو چکا ہے۔

(۱۸رمئی ۱۹۹۳ء)

باب نہم

اب تک کے مباحث کا خلاصہ

اب آگے بڑھنے سے پہلے مناسب ہے کہ اس سلسلۂ مضامین کی کڑیوں کو ذہن میں جوڑ لیا جائے جو اس سے قبل بیان ہو چکے ہیں۔ ان کا نقطۂ آغاز ایک ایسا خیال تھا جو ع ''آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں!'' کے مصداق اپنے بیرونی سفر کے دوران ایک روز اچانک ذہن میں بجلی کی مانند کوند گیا تھا۔ یعنی یہ کہ ہم قرآن مجید میں ﴿ضُرِبَتۡ عَلَيۡهِمُ الذِّلَّةُ وَالۡمَسۡكَنَةُ ۚ وَبَآءُوۡ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ؕ﴾ (البقرة: ٦١) ''ان پر ذلت و مسکنت مسلط کر دی گئی اور وہ اللہ کے عذاب میں گھر گئے'' کے الفاظ پڑھتے ہوئے آرام کے ساتھ یہ سمجھتے ہوئے گزر جاتے ہیں کہ یہ یہود کا ذکر ہے' حالانکہ موجودہ معروضی صورت حال میں ان الفاظ کا مصداقِ کامل یہود نہیں' ہم ہیں! پھر اس پر راقم اپنے قیامِ حرمین شریفین کے دوران بھی مسلسل غور کرتا رہا کہ اس کا سبب کیا ہے؟ اور اسی غور و فکر کا حاصل تھا جو پہلے ۲۵ مارچ ۱۹۹۳ء کو خطابِ عیدالفطر میں بیان ہوا اور اس کے بعد سے زیرِ نظر مضامین کی صورت میں پیش ہو رہا ہے جو روزنامہ نوائے وقت میں شائع ہوئے۔

اس سلسلے کا پہلا مضمون ''ہیں آج کیوں ذلیل؟'' کے عنوان سے ۱۶/اپریل کو شائع ہوا تھا جو متذکرہ بالا خیال ہی کی وضاحت پر مشتمل تھا کہ آج یہودی تو دنیا میں کل چودہ ملین یعنی ڈیڑھ کروڑ سے بھی کم ہونے کے باوجود بالفعل دولت و ثروت اور عزت و وجاہت کی چوٹی پر متمکن ہیں' یہاں تک کہ علامہ اقبال کے اس قول کے عین مطابق کہ ع ''فرنگ کی رگِ جاں پنجۂ یہود میں ہے!'' وہ دنیا کی عظیم ترین اور وقت کی واحد سپریم پاور یعنی ریاست ہائے متحدہ امریکہ کو کنٹرول کر رہے ہیں' جب کہ ہم مسلمان ڈیڑھ ارب کے لگ بھگ ہونے کے باوجود ع ''کس نمی پُرسد کہ بھیا کیستی؟'' کی سی کیفیت سے دو چار ہیں۔ البتہ یہ وضاحت اسی وقت کر دی گئی تھی کہ یہ صورتِ حال مستقل نہیں' عارضی ہے

اور بہت جلد بالکل برعکس ہو جانے والی ہے۔ پھر ۲۳/اپریل کو شائع ہوئی تھی راقم کی وہ تحریر جس کے بارے میں راقم کو اپنی کم علمی کے باوصف یہ ''زعم'' ہے کہ اس اچھوتے موضوع پر شاید ہی کبھی کسی نے اس وضاحت کے ساتھ لکھا ہو' یعنی ''قرآن کا قانونِ عذاب''۔ اور اب ہمیں اپنے موضوع کے جس حصے کی جانب پیش قدمی کرنی ہے' یعنی وہ عظیم حوادث اور تباہ کن واقعات جو حدیث نبویؐ میں واردشدہ پیشین گوئیوں کے مطابق مستقبل قریب میں پیش آنے والے ہیں' ان کے پس پردہ کارفرما حکمت خداوندی کے فہم کے لیے ضروری ہے کہ اس قانونِ عذابِ الٰہی کی بعض دفعات کو پھر سے ذہن میں تازہ کر لیا جائے۔ یعنی (۱) اوّلاً یہ کہ یہ دنیا اصلاً دارالامتحان ہے دارالجزاء نہیں! لیکن (۲) یہ قاعدۂ کلیہ پوری طرح صرف افراد پر منطبق ہوتا ہے' قوموں اور ملتوں پر نہیں! (بقول اقبال: ''فطرت افراد سے اِغماض بھی کر لیتی ہے۔ نہیں کرتی کبھی ملت کے گناہوں کو معاف!'') چنانچہ قوموں اور اُمتوں کا مجموعی حساب دنیا ہی میں چکا دیا جاتا ہے۔ (۳) دنیا میں ''عذابِ اکبر'' یعنی اللہ کے اجتماعی عذاب کی عظیم ترین صورت ''عذابِ استیصال'' کی ہے جس کے ذریعے پوری پوری قوموں کو نسیاً منسیاً کر دیا گیا' اور انہیں بیخ و بن سے اکھاڑ کر اُن کا نام ونشان تک مٹا دیا گیا۔ اور یہ صورت ان قوموں کے ساتھ پیش آئی جن کی جانب کوئی رسولؐ مبعوث کیا گیا اور اُس نے اپنی دعوت وتبلیغ اور قولی وعملی شہادت کے ذریعے اتمامِ حجت کا حق بدرجۂ تمام وکمال پورا کر دیا' لیکن اس کے باوجود قوم نے بحیثیت مجموعی کفر اور انکار کی روش پر اصرار کیا' جیسے قومِ نوح علیہ السلام' قوم ہود علیہ السلام' قومِ صالح علیہ السلام' قومِ لوط علیہ السلام' قومِ شعیب علیہ السلام اور آلِ فرعون۔ (۴) اس سے کمتر لیکن پیہم اور متواتر عذاب ان لوگوں پر آتا رہا جنہوں نے رسولوںؑ کی دعوت پر لبیک کہہ کر اُمتِ مسلمہ کی حیثیت اختیار کی اور اس حیثیت میں اللہ کے ساتھ عہد و میثاق کا رشتہ استوار کیا' لیکن پھر امتدادِ زمانہ کے باعث اپنے قول وقرار سے انحراف کرتے ہوئے شریعت کی حدود کو پامال کرنے اور اللہ کی کتاب کو پس پشت پھینک دینے کی روش اختیار کر لی۔ چنانچہ یہ ہے عذابِ اجتماعی کی وہ دوسری شکل جس کے کوڑے سابقہ اُمت مسلمہ یعنی بنی اسرائیل کی پیٹھ پر بھی پیہم پڑتے رہے' اور موجودہ اُمتِ مسلمہ یعنی ہم مسلمانوں پر بھی متواتر برس رہے ہیں۔

اس کے بعد جو مضمون جمعہ ۳۰/اپریل اور ہفتہ یکم مئی کو دو قسطوں میں شائع ہوا اس میں دو نکات کی وضاحت کی گئی۔ یعنی: (۱) یہ کہ اگرچہ دنیا میں انبیاء اور رسول علیہم السلام تو بہت سے گزرے ہیں، لیکن صاحب کتاب اور حامل شریعت اُمتیں پوری انسانی تاریخ کے دوران دو ہی ہوئی ہیں: سابقہ اُمتِ مسلمہ یعنی بنی اسرائیل اور موجودہ اُمتِ مسلمہ یعنی امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔ اور (۲) بیسویں صدی عیسوی کے اوائل تک بنی اسرائیل کی لگ بھگ ساڑھے تین ہزار سال کی تاریخ اور اُمت مسلمہ کی تیرہ سو سالہ تاریخ کے مابین نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قولِ مبارک کے مطابق حد درجہ مشابہت اور مماثلت پائی جاتی ہے کہ: ''میری اُمت پر بھی لازماً وہ سارے احوال واقع ہو کر رہیں گے جو بنی اسرائیل پر ہوئے، بالکل ایسی مشابہت کے ساتھ جو ایک جوڑی کی ایک جوتی کو دوسری جوتی سے ہوتی ہے!'' (ترمذی عن عبداللہ ؓ بن عمروؓ بن العاص) چنانچہ اس عرصے کے دوران سابقہ اُمت مسلمہ بھی دو بار عروج سے ہمکنار ہوئی اور دو مرتبہ زوال سے دوچار ہوئی، اور موجودہ اُمت مسلمہ یعنی مسلمان بھی دو ہی بار عزت و وجاہت اور قوت و سطوت کی انتہائی بلندیوں پر فائز ہوئے اور دو ہی مرتبہ ذلت و مسکنت کے قعر مذلت کی انتہائی پستیوں میں گرے۔ (بقول اقبال: ''پیش ما یک عالم فرسودہ است۔ ملت اندر خاکِ اُو آسودہ است!'')

اس کے بعد ۷ اور ۸ مئی کو دو ہی قسطوں میں ''بیسویں صدی عیسوی اور سابقہ اور موجودہ مسلمان اُمتیں'' کے عنوان سے مضمون شائع ہوا، جس میں واضح کیا گیا کہ بیسویں صدی عیسوی اس اعتبار سے بہت عجیب و غریب منظر پیش کرتی ہے کہ اس کے دوران ایک جانب دونوں اُمتوں پر حسب سابق عذابِ الٰہی کے کوڑے بھی برستے رہے، چنانچہ یہودیوں پر ''ہالوکاسٹ'' کی صورت میں ہٹلر کے ہاتھوں عذابِ الٰہی کا شدید ترین کوڑا پڑا اور مسلمانوں میں سے افضل ترحصے یعنی عربوں کے سینے میں اسرائیل کا خنجر پیوست ہوا، اور اس پر مستزاد اس کے ہاتھوں انہیں پہلے ۱۹۴۸ء میں اور پھر ۱۹۶۷ء میں عبرتناک ہی نہیں نہایت شرمناک ہزیمت کا مزہ چکھنا پڑا، یہاں تک کہ مسجد اقصیٰ کی بے حرمتی ہوئی اور وہ اس کی تولیت سے محروم ہو گئے، اور غیر عرب مسلمانوں میں سے بھی پاکستانی قوم کو ۱۹۷۱ء میں سقوطِ ڈھاکہ اور المیۂ مشرقی پاکستان کی صورت میں ذلت و رسوائی کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن

دوسری جانب اس صدی کے دوران دونوں ہی اُمتوں میں احیاء اور نشأۃِ ثانیہ کا عمل بھی شروع ہوا' اگرچہ اس کی ترقی اور پیش قدمی کی رفتار سابقہ اُمت یعنی یہود میں بہت تیز رہی' جب کہ اس کے مقابلے میں اُمتِ مسلمہ کا احیائی عمل نہایت سست رفتار رہا۔ چنانچہ یہود کی ترقی کی سرعتِ رفتار کا عالم تو یہ ہے کہ ۱۸۹۷ء میں ان کے چند ''بزرگوں'' (Elders of the Zion) نے جو سکیم تیار کی تھی اس کا پہلا ثمرہ کل بیس ہی برس بعد ۲ نومبر ۱۹۱۷ء کے ''اعلانِ بالفور'' کی صورت میں سامنے آ گیا' اور پھر کل تیس برس بعد ۱۹۴۸ء میں اسرائیل کا قیام عمل میں آ گیا۔ اور اِس وقت واقعی صورت حال یہ ہے کہ جہاں ایک جانب اسرائیل بذاتِ خود بھی ایک بہت بڑی عسکری قوت ہے' اور اس پر مستزاد اسے پوری عیسائی دنیا کی حمایت ونصرت بھی حاصل ہے' وہاں دوسری جانب وقت کی واحد سپریم پاور تو یہود کے شکنجے میں جکڑی ہوئی ہے ہی' پوری دنیا کے مالیاتی نظام پر بھی ان کا کامل تسلط ہے اور عالمی معیشت کا لیور تو اس طرح ان کے ہاتھ میں ہے کہ جب چاہیں ذرا سی جنبش کے ذریعے عظیم ترین سلطنتوں کو تہہ وبالا اور ریزہ ریزہ کر کے رکھ دیں۔ (جس کی ایک نمایاں مثال سوویت یونین کا حالیہ حشر ہے!) چنانچہ اِس وقت حقیقی اور واقعی صورت حال یہ ہے کہ ''عظیم تر اسرائیل'' کے قیام کے لیے عملی اقدام میں کوئی تأخیر یہود اور اسرائیل کی اپنی حکمت عملی ہی کے تحت تو ہو سکتی ہے' دنیا میں کوئی دوسری ایسی طاقت بالفعل موجود نہیں ہے جو اس کی راہ میں مزاحم ہو سکے! ـــــ دوسری طرف مسلمانانِ عالم بھی نہ صرف یہ کہ مغربی استعمار کی براہِ راست غلامی سے نجات حاصل کر چکے ہیں' بلکہ ان میں اپنے اصل تشخص کی بازیافت اور اپنی تہذیب وتمدن کے احیاء اور اسلام کو ایک ''دین'' یعنی نظامِ زندگی اور سسٹم آف سوشل جسٹس کی حیثیت سے قائم ونافذ کرنے کی شدید اُمنگ پیدا ہو چکی ہے' جس کی لہر مشرق سے مغرب تک پورے عالم اسلام میں ؏ ''ہے ایک ہی نغمہ' کہیں اونچا کہیں مدھم!'' اور ''ہے ایک ہی جذبہ' کہیں واضح کہیں مبہم!'' کی شان کے ساتھ روز بروز شدید سے شدید تر ہوتی چلی جا رہی ہے۔ تاہم واقعہ یہ ہے کہ اس ''احیائی دور'' میں یہودی مسلمانوں سے بہت آگے نکل چکے ہیں۔ اور دراصل اسی معروضی حقیقت میں آئندہ پیش آنے والے عظیم حوادث اور ہولناک واقعات کا راز مضمر ہے' جس پر مفصل گفتگو آئندہ ہوگی۔

اس کے بعد دو ہی اقساط میں، یعنی ۱۴ اور ۱۶ مئی کو وہ تحریر شائع ہوئی جس میں ''ابراہیمی مذاہب کا ثالثُ ثلاثۃ'' کے عنوان سے یہ حقائق واضح کیے گئے کہ: (۱) عیسائیت اپنی اصل اور آغاز کے اعتبار سے تو یقیناً ابراہیمیؑ مذاہب ہی کے سلسلے کی ایک کڑی تھی۔ چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پیروکار سابقہ اُمت مسلمہ ہی کا ''فرقہ'' سمجھے جاتے تھے، لیکن سینٹ پال کی ترمیمات کے نتیجے میں موجودہ عیسائیت ایک بالکل جداگانہ مذہب کی صورت اختیار کر چکی ہے، جس کا کوئی حقیقی اور معنوی تعلق ابراہیمیؑ مذاہب کے ساتھ باقی نہیں رہا۔ (۲) یہودیوں اور مسلمانوں دونوں پر عذابِ الٰہی کے دوسرے دَور کے ضمن میں یورپ کی عیسائی اقوام ہی ''کوڑے'' کے طور پر استعمال ہوتی رہیں۔ چنانچہ یہودیوں پر بھی چوتھی صدی عیسوی کے بعد سے آج تک سارا تشدد اور کُل تعذیب عیسائیوں ہی کے ہاتھوں ہوئی اور مسلمانوں پر بھی پہلے دورِ عذاب کی ابتدا بھی صلیبیوں ہی کے ہاتھوں ہوئی تھی۔ اگرچہ اُس وقت اصل عذاب تاتاریوں کے ہاتھوں آیا تھا، لیکن دوسرے دورِ عذاب کے دوران تو، جو چودھویں اور پندرھویں صدی میں ہسپانیہ سے اسلام اور مسلمانوں کے خاتمے سے لے کر بیسویں صدی کے اوائل میں سلطنت عثمانیہ کے خاتمے تک جاری رہا، عذابِ الٰہی کے تمام کوڑے یورپ کی عیسائی اقوام ہی کے ہاتھوں پڑے۔ (چنانچہ آئندہ پیش آنے والے واقعات کے ضمن میں یہ حقیقت بھی بہت اہم رول ادا کرنے والی ہے!) (۳) یہودیوں نے نہایت ہوشیاری اور چابک دستی سے اپنے ازلی اور جانی دشمنوں یعنی عیسائیوں کو پہلے رام کیا اور پھر باقاعدہ زیر کر لیا۔ اس کے لیے انہوں نے پہلے ہسپانیہ کی فتح میں مسلمانوں کی مدد کی، پھر مسلم اسپین کو اپنے مورچے اور کمین گاہ کے طور پر استعمال کرتے ہوئے عیسائی یورپ کی فصیل میں نقب لگائی، اور علم و حکمت کے جو سوتے قرطبہ اور غرناطہ کی یونیورسٹیوں سے پھوٹ کر یورپ کی جانب بہہ رہے تھے ان میں ''لبرلزم'' کے عنوان سے فکری آوارگی اور اخلاقی بے راہ روی کا زہر شامل کر کے ایک جانب یورپ کے معاشرے کو تہہ و بالا کر کے رکھ دیا اور دوسری جانب ''پروٹسٹنٹ ازم'' کی راہ سے کلیسا کی گرفت کو کمزور کر کے سودی کاروبار کی اجازت حاصل کر لی اور اس طرح یورپ کو اپنے اقتصادی شکنجے میں جکڑ لیا۔

چنانچہ اس وقت حقیقی اور معروضی صورت حال یہ ہے کہ پوری عیسائی دنیا پر فیصلہ کن غلبہ حاصل ہے ''واسپ'' (White Anglo Saxon Protestants) کو جن کے سرخیل ہیں امریکہ اور برطانیہ اور ان کے سر اور شانوں پر سوار ہے ''صیہونیت'' کا سازشی ٹولہ!

اور بالآخر جمعہ ۲۱ مئی اور اتوار ۲۳ مئی کو دو قسطوں میں شائع ہوئی ''آنے والے دَور کی ایک واضح تصویر'' کے عنوان والی تحریر جس کی پہلی قسط میں سب سے زیادہ حتمی و یقینی اور قطعی وشدنی بات کا تذکرہ ہوا یعنی قرآنی اصطلاح میں الواقعہ القارعہ الحاقہ اور السّاعہ کا ذکر جسے عرفِ عام میں ''قیامت'' کہہ دیا جاتا ہے (حالانکہ اصل قرآنی اصطلاح کے مطابق قیامت کے لفظ کا اطلاق بعث بعد الموت کے بعد حساب کتاب اور جزا وسزا کے فیصلے کے دن یعنی ''یوم الدین'' پر کیا جاتا ہے) اور دوسری قسط میں اس سے قبل کے اتنے ہی حتمی اور یقینی واقعے کا تذکرہ ہوا جو قرآن حکیم سے ''دلالت النص'' اور احادیث نبویہؐ سے ''صراحت النص'' کے طریق پر تو ثابت ہے ہی فلسفۂ اقبال کے شارح ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم کی رائے میں نظریۂ ارتقاء کے بھی منطقی اور لازمی نتیجے کی حیثیت رکھتا ہے یعنی اسلام کا عالمی غلبہ اور عالمی خلافت علیٰ منہاج النبوت کا قیام!

اب آئندہ ہمیں ان عظیم واقعات وحوادث پر گفتگو کرنی ہے جن کی تفصیلی خبریں احادیث نبویہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں وارد ہوئی ہیں یعنی سلسلۂ ملاحم اور الملحمۃ الکبریٰ بیعت مہدی خروجِ دجال نزولِ مسیحؑ استیصالِ یہود اور خاتمۂ عیسائیت جن کے بارے میں ہم اپنی یہ حتمی اور سوچی سمجھی رائے پیش کر چکے ہیں کہ ان کی واقعاتی تفاصیل اور ان کے وقوع کے ٹائم ٹیبل سے قطع نظر جہاں تک ان کے مجموعی نقشے کا تعلق ہے وہ دونوں مسلمان اُمتوں کی تاریخ اور قرآن کے اس قانونِ عذاب کے فریم میں بالکل فٹ بیٹھتا ہے جس کا اجمالی ذکر آج کی صحبت میں بھی ہو گیا ہے۔ آئندہ ہم ان میں سے ایک ایک کے بارے میں مختصر گزارشات پیش کریں گے۔ ان شاء اللہ العزیز!

(۳۱ مئی ۱۹۹۳ء)

باب دھم

پندرہویں صدی ہجری: توقعات اور اندیشے

بارہ سال قبل کی گزارشات

۲ جون کو نماز عیدالاضحیٰ سے فراغت کے بعد باغ جناح لاہور سے واپس آ کر اپنے پڑھنے لکھنے کے کمرے میں کسی قدر خالی الذہن بیٹھا تھا کہ اچانک ذہن اس الجھن میں مبتلا ہو گیا کہ غلبۂ اسلام سے قبل کے حوادث یعنی سلسلۂ ملاحم، بیعت حضرتِ مہدی، خروجِ دجال، نزولِ مسیحؑ، اِستیصالِ یہود اور عیسائیت کے اسلام میں مدغم ہونے کو کس ترتیب اور اسلوب سے ضبط تحریر میں لایا جائے۔ اس لیے کہ احادیثِ صحیحہ میں وارد شدہ خبریں بھی اپنے مقام پر، اور میرا ایمان و یقین اور وثوق و اعتماد بھی اپنی جگہ، لیکن آج کا جدید تعلیم یافتہ انسان ان مباحث سے طبعاً الرجک واقع ہوا ہے اور ان پر گفتگو کو ضعیف الاعتقادی کا مظہر اور وقت کا ضیاع سمجھتا ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ ان میں سے بعض مباحث بہت تفصیل طلب ہیں، جب کہ ایک روزنامے کے ''کالم'' کا مزاج اور اس کی محدودیت دونوں ان تفاصیل کی متحمل نہیں ہو سکتیں۔ میں کچھ دیر اسی ادھیڑ بُن میں رہا، لیکن پھر اچانک خیال آیا کہ اب سے دس بارہ سال قبل میں نے اس موضوع پر ایک مفصل تقریر کی تھی جو ماہنامہ ''میثاق'' میں شائع بھی ہو گئی تھی، کیوں نہ اسے دیکھا جائے، شاید کہ معاملہ آسان ہو جائے۔ چنانچہ اسے نکال کر پڑھا تو ایک تو میں خود ورطۂ حیرت میں ڈوب کر رہ گیا کہ اب سے ساڑھے بارہ سال قبل جو باتیں بہت دور و دراز نظر آتی تھیں، اس عرصے کے دوران نوشتۂ دیوار کی طرح عالم واقعہ میں رونما ہو چکی ہیں۔ اور دوسری طرف میری مشکل واقعتاً آسان ہو گئی اور دل نے یہی رائے دی کہ پہلے اس کے

متعلقہ حصے قارئین ''نوائے وقت'' کی خدمت میں پیش کر دیے جائیں۔ اس سے ایک اجمالی نقشہ قارئین کے سامنے آ جائے گا۔ پھر بعض معاملات کی کسی قدر وضاحت اور اس عرصے کے دوران پیش آمدہ واقعات سے استشہاد کے ذریعے پورا مرحلہ بآسانی طے ہو جائے گا' اور اس طرح ان آراء میں اضافی وزن اس بنا پر پیدا ہو جائے گا کہ یہ خیالات ''مشتے کہ بعد از جنگ یاد آید'' کے مصداق خلیج کی جنگ کے بعد پیدا نہیں ہوئے' بلکہ اس سے لگ بھگ دس سال قبل وضاحت کے ساتھ بیان ہو چکے تھے۔

واضح رہے کہ یہ تقریر میں نے ۲۴/ اکتوبر ۱۹۸۰ء کو اپنے دوسرے سفر امریکہ سے واپسی پر مسجد شہداء' ریگل چوک' لاہور میں کی تھی۔ پھر اسے ٹیپ سے صفحۂ قرطاس پر منتقل کر کے جوں کا توں ماہنامہ ''میثاق'' لاہور کی اشاعت بابت جنوری فروری ۱۹۸۱ء میں شائع کر دیا گیا تھا۔ سفر امریکہ کے دوران اس موضوع کی جانب میرا ذہن جن اسباب کی بنا پر منتقل ہوا اُن میں سے بعض کا ذکر تو اس تقریر کے آغاز میں موجود ہے' لیکن ایک اہم بات جو اُس وقت بیان ہونے سے رہ گئی تھی' یہ تھی کہ میں نے اپنے ۱۹۷۹ء اور ۱۹۸۰ء کے امریکہ کے سفر کے دوران کثرت کے ساتھ یہ سٹکرز کاروں کے پچھلے شیشوں یا بمپرز پر چسپاں دیکھے کہ ''یسوع مسیحؑ تشریف لا رہے ہیں!'' (Jesus is Coming) جس سے شدت کے ساتھ احساس ہوا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شخصیت اور ان کے ورودِ ثانی کو ہمارے اور عیسائیوں کے مابین ایک بہت بڑی قدرِ مشترک کی حیثیت حاصل ہے۔ بہرحال اب اس تمہید کے بعد میری اس تقریر کے متعلقہ حصے ملاحظہ ہوں۔ میں نے اب اس میں تقریر کو تحریر کا انداز دینے کے لیے صرف کچھ لفظی تبدیلی اور تقدیم وتأخیر کا فرق کیا ہے اور بعض غیر ضروری تفاصیل حذف کر دی ہیں' ورنہ اصلاً یہ آج سے ساڑھے بارہ سال قبل ہی کی تقریر ہے۔

(اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء' نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود وسلام اور ماثورہ دعاؤں کے بعد عرض کیا گیا)

حضرات! میری آج کی گفتگو کا عجیب پہلو یہ ہے کہ مجھے اعلان کے مطابق

ایک ہی نشست میں دو موضوعات پر گفتگو کرنی ہے' ایک موضوع تو میرے شمالی امریکہ کے حالیہ دورے کے تأثرات و مشاہدات سے متعلق ہے (تقریر کا یہ حصہ اِس وقت تو بالکلیہ حذف کیا جا رہا ہے' لیکن محسوس ہوتا ہے کہ اگر کسی موقع پر اسے بھی ہدیۂ قارئین کیا جائے تو اِن شاء اللہ مفید بھی ہوگا اور موجب دلچسپی بھی!) اور دوسرا پندرہویں صدی سے تعلق رکھتا ہے' جس کا آغاز ہو رہا ہے اور جس کو دوسرے مسلمان ممالک کی طرح ہمارے ملک میں بھی سرکاری سطح پر منایا جا رہا ہے' بلکہ اس کے استقبال کے لیے کافی پہلے سے مختلف تقاریب منعقد ہو رہی ہیں۔ اس موضوع پر گفتگو کی ضرورت اس لیے بھی محسوس ہوئی کہ عوام الناس ہی نہیں ہمارے خواص کے بھی قابل ذکر حصے میں چودہویں اور پندرہویں صدی کے متعلق عجیب و غریب باتیں پھیلی ہوئی ہیں۔ یہ باتیں کچھ تو ہمارے اُن واعظین کے باعث پھیلی ہیں جن کا مبلغ علم صرف سنی سنائی باتوں اور سینہ بہ سینہ حاصل ہونے والی معلومات تک محدود ہوتا ہے' پھر اس میں کافی دخل عوام الناس کی اس عادت کا بھی ہے کہ وہ سنی سنائی باتوں میں اپنی طرف سے اضافے بھی کرتے رہتے ہیں اور اس طرح بات کا بتنگڑ بن جاتا ہے۔

اس موضوع پر کہ اُمت مسلمہ اور ملت اسلامیہ چودہ سو سال میں عروج و زوال کے مختلف اَدوار سے گزرتی ہوئی کہاں سے کہاں پہنچی ہے اور فی الوقت ہم کس صورتِ حال سے دو چار ہیں' میں پہلے بھی مفصل تقریریں کر چکا ہوں اور اُمت مسلمہ کے عروج و زوال کے دو دو اَدوار کے متعلق میرے تجزیے اور میرے مطالعے کا حاصل تحریری شکل میں بھی آ چکا ہے' لیکن علم' مطالعہ اور مشاہدہ کی کوئی آخری حد نہیں ہوتی۔ اس ضمن میں بعض نئی باتیں حال ہی میں میرے سامنے آئی ہیں جن کو میں آج آپ کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کروں گا۔

ان نئی باتوں کی جانب ذہن منتقل ہونے کا سبب یہ حسنِ اتفاق ہوا کہ شمالی امریکہ میں کافی عرصہ سے ایک اسلامک میڈیکل ایسوسی ایشن قائم ہے جس کا امریکہ کے مختلف شہروں میں ہر سال ایک کنونشن منعقد ہوتا ہے۔ پچھلے سال جب میں

پہلی بار امریکہ گیا تھا تو ڈیلاس میں ان کے سالانہ کنونشن کا انعقاد ہو رہا تھا' جس میں ایسوسی ایشن کی جانب سے مجھے مہمان مقرر کی حیثیت سے مدعو کیا گیا تھا اور میں نے وہاں تقریر بھی کی تھی۔ امسال میں جب دوسری مرتبہ دعوتی دورے پر شمالی امریکہ گیا تو ان کا سالانہ کنونشن مشہورِ عالم آبشار نیاگرا کے سامنے نیاگرا سٹی میں منعقد ہونے والا تھا' جس میں شریک ہونے اور آخری اجلاس میں ''پندرھویں صدی ہجری کے چیلنج' خطرات اور توقعات'' کے عنوان پر ایک مقالہ پڑھنے کے لیے مجھے دعوت دی گئی تھی۔ میں نے اللہ تعالیٰ کی نصرت و توفیق سے اس موضوع پر انگریزی میں ایک مقالہ لکھا جس کے دوران کچھ پہلو اور نکات ایسے ذہن میں آئے کہ میں نے چاہا کہ ان کو آپ کے سامنے بھی بیان کروں۔ (یہ مقالہ پاکستان میں روز نامہ ''مسلم'' اسلام آباد' اور بھارت میں ہفت روزہ ''Radiance'' دہلی میں شائع ہو چکا ہے)

احادیث شریفہ میں قیامت کی جو علامات بتائی گئی ہیں ان کا مفاد یہ ہے کہ وہ ہمارے لیے رہنمائی کا ذریعہ بنیں اور ہم چوکس و ہوشیار رہیں۔ البتہ یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لیجیے اور اس معاملے میں کوئی مغالطہ لاحق ہو تو اس کو دور کر لیجیے کہ کسی صدی کے تعین کے ساتھ' خواہ وہ چودھویں صدی ہو خواہ پندرہویں صدی' کوئی خبر نہ قرآن مجید میں بیان ہوئی ہے نہ احادیث شریفہ میں۔ علاماتِ قیامت کے باب میں احادیثِ نبویہؐ میں غور و فکر کرنے سے البتہ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس دنیا کا ڈرامہ اپنے ڈراپ سین یعنی اختتام سے زیادہ دور نہیں ہے۔ اس لیے کہ دنیا میں وہ نقشہ اور وہ حالات تیار ہوتے نظر آ رہے ہیں جن کی خبریں الصادق المصدوق جناب محمد ﷺ نے دی تھیں۔ میں ان حالات کا جن سے اس کرۂ ارض کو مستقبل قریب میں سابقہ پیش آنے والا ہے' ایک اجمالی نقشہ آپ کے سامنے آج کی اس گفتگو میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے اس ضمن میں جامعہ مدنیہ لاہور کے مہتمم اور شیخ الحدیث حضرت مولانا سید حامد میاں مدظلہٗ (افسوس کہ مولانا موصوف کا انتقال ۳ مارچ ۱۹۸۸ء کو بالکل اچانک انداز میں

ہوگیا۔ غَفَرَ اللّٰہ لَنَا وَلَہٗ اَدخِله فی اعلٰی عِلِّیّین ......آمین!) سے بہت مدد ملی ہے۔ مولانا موصوف نے اسی موضوع پر عیدالاضحیٰ کے موقع پر تقریر بھی کی تھی' پھر میرا اس موضوع پر ان سے آج ہی تبادلۂ خیالات بھی ہوا ہے اور اس گفتگو سے میری اپنی سوچ میں مزید پختگی پیدا ہوئی ہے' اور میری ان گزارشات میں ان سے استفادہ بھی شامل ہے۔

قربِ قیامت کی علامات کے بارے میں احادیث نبویہؐ میں جو کچھ بیان ہوا ہے ان سے ذہن میں آنے والے واقعات وحالات کی ایک ترتیب بھی بنتی ہے اور یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ یہ واقعات مختلف مراحل میں رونما ہوں گے۔ ہر مرحلے میں کتنی مدت صرف ہوگی اور کتنا عرصہ لگے گا' اس کا تعین ممکن نہیں' لیکن مختلف احادیث نبویہؐ کو جمع کر کے غور وتدبر کیا جائے تو ایک اجمالی نقشہ اور خاکہ ذہن میں ضرور مرتب ہو جاتا ہے۔ بہرحال اس طرح جو نقشہ میرے ذہن میں مرتب ہوا ہے وہ میں آپ کے سامنے رکھتا ہوں۔

احادیث شریفہ سے ایک بات تو پورے جزم اور یقین کے ساتھ معلوم ہوتی ہے کہ وقوعِ قیامت کے قریب کچھ جنگیں ہوں گی جن کی ہولناکیاں اور تباہ کاریاں ایسی وسعت کی حامل ہوں گی کہ ان کے سامنے سابقہ تمام جنگوں کی ہولناکیاں اور تباہ کاریاں ماند پڑ جائیں گی۔ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلے کی پہلی جنگ میں مسلمان اور عیسائی ایک تیسری طاقت کے خلاف متحد ہوں گے' اس جنگ میں بے پناہ خونریزی ہوگی اور نتیجے کے طور پر مسلمانوں اور عیسائیوں کی متحدہ قوت کو فتح وکامیابی حاصل ہوگی۔ یہ پہلا مرحلہ ہے۔ اس کے بعد دوسرے مرحلے کے بارے میں احادیث شریفہ سے یہ رہنمائی ملتی ہے کہ اس فتح کے بعد مسلمانوں اور عیسائیوں میں سخت تفرقہ اور اختلافات پیدا ہوں گے' عیسائی اس فتح کو اپنے مذہب' اپنے عقائد اور اپنی صلیب کی طرف منسوب کریں گے اور اس کو اپنے مذہب کی حقانیت کی دلیل بنائیں گے۔ چنانچہ اتحاد پارہ پارہ ہو جائے گا اور یہ تفرقہ مسلمانوں اور عیسائیوں کے مابین مسلح معرکہ

آرائی اور ایک شدید جنگ کی صورت اختیار کر لے گا جس میں مسلمانوں کو زبردست ہزیمت اور نقصانات اٹھانے پڑیں گے۔ چنانچہ ترکی‘ لبنان‘ شام اور عراق مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل جائیں گے‘ حتیٰ کہ عیسائی مسلمانوں کو شکست پر شکست دیتے اور دباتے ہوئے حجاز میں خیبر کے مقام تک پہنچ جائیں گے۔ اس جنگ میں یہودیوں کی تمام دلی ہمدردیاں اور عملی تعاون عیسائیوں کو حاصل ہو گا اور ان کا سرمایہ‘ ان کی ٹیکنیکل مہارت‘ ان کے کارخانوں میں تیار ہونے والا مہیب و مہلک اسلحہ اور ان کے پراپیگنڈے کے ہتھیار سب عیسائیوں کی پشت پر ہوں گے‘ لیکن خود وہ براہِ راست جنگ میں شریک نہیں ہوں گے۔ احادیث کے مطابق اس مرحلہ پر حضرت مہدیؒ کے ہاتھ پر بیعت ہو گی۔ لیکن اسی موقع پر یہ بات بھی جان لیجیے کہ حضرت مہدی کی حدیثِ نبویؐ میں بیان شدہ شخصیت اور اہل تشیع کی اعتقادی شخصیت میں زمین و آسمان کا فرق ہے اور ان دونوں کے مابین سوائے لفظ اور نام کے اشتراک کے کوئی اور چیز مشترک نہیں ہے۔ وہ جس مہدی کے ماننے والے ہیں وہ ان کے بارہویں امام ہیں جو اِن کے عقیدے کے مطابق روپوش ہو گئے تھے اور کسی غار میں مقیم ہیں اور اُس وقت وہی ظاہر ہوں گے— ہمارا یہ عقیدہ نہیں ہے۔ احادیث نبویہؐ سے ہمارے سامنے حضرت مہدیؒ کی شخصیت اور ان کے ظہور کا جو نقشہ آتا ہے وہ یہ ہے کہ وہ عرب کے ایک قائد اور ایک راہنما کی حیثیت سے ابھریں گے۔ ان کا نام محمد ہو گا اور ان کے والد کا نام عبداللہ۔ وہ بیت اللہ شریف میں کعبہ کا طواف کر رہے ہوں گے کہ لوگ ان کو پہچانیں گے کہ یہی مہدیٔ موعود ہیں۔ وہ خود مہدی ہونے کے دعوے دار نہیں ہوں گے‘ بلکہ لوگ ان کو از خود پہچانیں گے اور کوئی ندائے غیبی اس امر کی تائید کرے گی۔ مسلمان ان کی قیادت میں متحد اور مجتمع ہو کر عیسائی قوتوں سے جنگ و قتال کریں گے اور ان کو پیچھے ہٹاتے ہوئے قسطنطنیہ تک پہنچ جائیں گے۔ اور جب قسطنطنیہ کو عیسائیوں کے چنگل سے آزاد کرا رہے ہوں گے تو پھر ایک اور مرحلہ شروع ہو جائے گا جس کو ہم تیسرا مرحلہ کہہ سکتے ہیں۔ وہ وقت دجالِ اکبر

کے ظہور کا ہوگا۔ اس کے ظہور کی خبر اس کے قبضے میں غیر معمولی اسلحہ اور عجیب و غریب کرشمے ہونے کے باعث تمام عالم میں آناً فاناً پھیل جائے گی۔ بعض احادیث میں اگرچہ اس کے خروج کی جگہ اصفہان (ایران کا شہر) بتائی گئی ہے' لیکن وہ خود بھی یہودی النسل ہوگا اور یہودیوں کی مسلح اور بظاہر ناقابل تسخیر قوت اس کی پشت پر ہوگی۔ وہ پوری قوت کے ساتھ مسلمانوں پر حملہ آور ہوگا۔ عیسائی قوتیں بھی اس کے ساتھ مل جائیں گی اور مسلمانوں کو دوبارہ شدید ہزیمت وشکست سے دوچار ہونا پڑے گا اور وہ شدید نقصانات اٹھاتے ہوئے حضرت مہدی کی قیادت میں دمشق کی طرف پلٹیں گے۔ احادیثِ نبویہؐ کی رو سے یہ وقت ہوگا عیسیٰ ابن مریم یعنی مسیح علیہ السلام کے آسمان سے نزول کا' جس کا ذکر میں آگے چل کر کروں گا۔

یہاں تھوڑا سا توقف کر کے اس بات کو سمجھئے کہ احادیث کی روشنی میں مسلمانوں کے لیے کیسے کیسے سخت مراحل اور صبر آزما امتحانات آنے والے ہیں' اور ان کے جلو میں تباہی' ہلاکت اور خون ریزی کے کیسے کیسے طوفان اٹھنے والے ہیں۔ ہمیں بالعموم یہ کہہ کر تھپکی اور لوری دے دی جاتی ہے کہ بس اب پندرہویں صدی غلبۂ اسلام کی صدی ہے اور روشن مستقبل ہمارا منتظر ہے' اور ہم خوش ہو جاتے ہیں اور ان ''امانی'' سے بہل جاتے ہیں اور ہمیں ان فرائض کا احساس نہیں ہوتا جو اعلائے کلمۃ اللہ' احقاقِ حق' ابطالِ باطل اور غلبۂ دینِ متین کی سعی و جہد کے ضمن میں ہر کلمہ گو کے ذمے ہیں۔ حالانکہ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ کن انتہائی کٹھن مراحل سے سابقہ پیش آنے والا ہے اور قطرے کے گہر ہونے تک اس پر کیا کچھ بیتنے والی ہے اور ان امتحانوں سے کامیابی کے ساتھ گزرنے کے لیے ہمیں حقیقی ایمان کی کتنی ضرورت ہے۔ مشرقِ وسطیٰ میں سلطنت اسرائیل کے قیام اور دنیا بھر سے لاتعداد یہودیوں کی وہاں منتقلی' پھر ان ممالک کی طرف سے جو عظیم اکثریت کے لحاظ سے عقیدۃً عیسائی ہیں ''اسرائیل'' کی سرپرستی اور معاونت اور اس کی جارحانہ اور توسیع پسندانہ پالیسی کو پیشِ نظر رکھئے اور غور کیجیے کہ مستقبل میں کون کون سے علاقے محاذِ جنگ بننے والے ہیں۔

بہرحال صحاحِ ستہ جیسی بلند پایہ کتب احادیث کے علاوہ دوسرے بہت سے مجموعوں کے ذریعے جو روایات ہم تک پہنچی ہیں' ان میں قطعیت اور صراحت کے ساتھ دجال اکبر کے ظہور اور حضرت مسیح علیہ السلام کے نزول کی سال وسن اور صدی کے تعین کے بغیر خبریں دی گئی ہیں۔ ان احادیثِ صحیحہ کی روشنی میں ہمارا اس بات پر کامل ایمان ہے کہ حضرت عیسیٰ ابن مریم علیہما السلام بنفس نفیس آسمان سے نزول فرمائیں گے۔ صحیح مسلم' جامع ترمذی' سنن ابوداؤد اور سنن ابن ماجہ میں نزول مسیحؑ کا نقشہ اس طرح کھینچا گیا ہے کہ ''دجال جب مسلمانوں کو پامال کرتا ہوا دمشق کا محاصرہ کرلے گا تو اللہ تعالیٰ مسیح ابن مریمؑ کو بھیج دے گا اور وہ دِمشق کے مشرقی حصے میں سفید مینار کے پاس زرد رنگ کے دو کپڑے پہنے ہوئے دو فرشتوں کے بازوؤں پر اپنے ہاتھ رکھے ہوئے اتریں گے۔ جب وہ سر جھکائیں گے تو ایسا محسوس ہوگا کہ قطرے ٹپک رہے ہیں اور جب سر اٹھائیں گے تو موتی کی طرح قطرے ڈھلکتے نظر آئیں گے' ان کے سانس کی ہوا جس کافر تک پہنچے گی' اور وہ حدنظر تک جائے گی' وہ کافر زندہ نہ بچے گا۔ پھر ابن مریمؑ دجال کا پیچھا کریں گے اور لُدّ کے دروازے پر اسے جا پکڑیں گے اور قتل کردیں گے۔'' ایک اور حدیث میں دجال کے ظہور کے سلسلہ میں آتا ہے کہ ''پھر عیسیٰ علیہ السلام نازل ہوں گے اور اللہ تعالیٰ دجال کو افیق کی گھاٹی کے قریب ہلاک کردے گا۔'' ان احادیث میں دجال کے قتل کا مقام لُد اور افیق کی گھاٹی کا قرب بیان کیا گیا ہے' تو جان لیجیے کہ لُد (لِڈّا) فلسطین میں اسرائیل کے دارالسلطنت تل ابیب سے چند میل کے فاصلے پر واقع ہے اور یہ اسرائیل کا سب سے بڑا ہوائی اڈہ ہے۔ افیق آج کل فیق کے نام سے موسوم ہے۔ یہ شام اور اسرائیل کی سرحد کے قریب شام کا آخری شہر ہے' جس سے آگے اسرائیل کی سرحد شروع ہو جاتی ہے اور لُد کے ہوائی اڈے کی طرف جاتی ہے۔ ان واضح احادیث اور تھوڑے سے لفظی اختلاف کے ساتھ اسی مضمون کی بہت سی احادیث سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ نزول فرمانے والے بنفس نفیس وہی حضرت مسیح عیسیٰ ابن مریم علیہما السلام ہوں گے۔ احادیثِ صحیحہ میں یہ

وضاحت وصراحت بھی ملتی ہے کہ حضرت مسیح عیسیٰ ابن مریم علیہا السلام دوبارہ اس دنیا میں بحیثیت نبی تشریف نہیں لائیں گے، بلکہ اُس وقت ان کی حیثیت خاتم النبیین آخرالرسل جناب محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک اُمتی کی ہوگی۔ احادیث میں ان کے نزول کا وقت نمازِ فجر کے قریب بیان ہوا ہے اور یہ بات بھی مذکور ہے کہ ان سے کہا جائے گا کہ آپ آگے بڑھئے اور نماز کی امامت فرمائیے، لیکن آنجنابؑ انکار کر دیں گے اور کہیں گے کہ تمہارے امام ہی کو آگے بڑھنا چاہیے۔ چنانچہ وہ حضرت مہدیؒ کی اقتداء ہی میں نماز ادا کریں گے۔ صحیحین میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کیسے ہو گے تم لوگ جب کہ تمہارے درمیان ابن مریمؑ اتریں گے اور تمہارا امام اُس وقت تم ہی میں سے ہوگا!'' اس مضمون کی بکثرت احادیث ہیں۔ یہ علامت ہوگی اس بات کی کہ ان کی حیثیت اُمت محمد علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے ایک اُمتی کی ہوگی اور اُمت مسلمہ کا نظم برقرار رہے گا۔

نزولِ مسیح علیہ السلام کے سلسلے کی جملہ احادیث پر غور و تدبر سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ان کے نزول کا اصل مشن دجال کا قتل اور یہود کو کیفر کردار تک پہنچانا ہے۔ چونکہ قرآن حکیم میں رسولوں کے باب میں اللہ تعالیٰ کی یہ سنت تواتر کے ساتھ سامنے آتی ہے کہ جن قوموں کی طرف رسولوں کی براہِ راست بعثت ہوتی ہے وہ اگر بحیثیت مجموعی رسول پر ایمان لانے سے انکار کر دیں تو ہلاک کر دی جاتی ہیں۔ جیسے قومِ نوح، قومِ لوط، قومِ صالح اور قومِ شعیب علیہم السلام پر عذابِ استیصال کے نزول اور ان کی ہلاکت و بربادی کا قرآن حکیم میں تفصیل سے متعدد بار ذکر ہے۔ از روئے قرآن مجید حضرت مسیح علیہ السلام کی بعثت اصلاً بنی اسرائیل کی طرف ہوئی تھی، جیسا کہ سورۂ آل عمران کی آیت ۴۹ کے آغاز میں فرمایا ''وَرَسُوْلًا اِلٰی بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ''۔ لیکن ہمیں معلوم ہے کہ بنی اسرائیل کو حضرت مسیح علیہ السلام کی تکذیب کے جرم کی پاداش میں ہلاک نہیں کیا گیا، ان پر عذابِ استیصال نہیں آیا، لہٰذا ان کی ہلاکت کا مرحلہ سنت اللہ کے مطابق ابھی آنا

ہے۔اسی سنت اللہ کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول ہوگا جن کو زندہ آسمان پر اٹھالیا گیا تھا اور ان ہی کے ہاتھوں سے یہود سنت اللہ کے مطابق برباد، ہلاک اور نیست و نابود کر دیے جائیں گے اور ان کا بالکلیہ استیصال ہوگا۔ یہودیوں کے استیصال کے ساتھ ساتھ نزولِ مسیحؑ کے بعد عیسائیت کا بھی خاتمہ ہو جائے گا اور تمام عیسائی حلقہ بگوشِ اسلام ہو جائیں گے اور تمام دنیا پر دین الحق کی حکمرانی ہو گی، اور اس طرح ''لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّه'' کی شان بکمال وتمام سارے عالم پر ظاہر ہو جائے گی۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بخاری ومسلم اور ترمذی ومسند احمد میں مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''قسم ہے اُس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! ضرور اُتریں گے تمہارے درمیان ابن مریم حاکم عادل بن کر، پھر وہ صلیب کو توڑ دیں گے (فیکسر الصلیب) اور خنزیر کو ہلاک کریں گے (ویقتل الخنزیر) اور جنگ کا خاتمہ کر دیں گے۔ دوسری روایت میں جزیے کا لفظ ہے۔ یعنی جزیہ ختم کر دیں گے (ویضع الحرب او یضع الجزیة) اور مال کی وہ کثرت ہوگی کہ اس کو قبول کرنے والا کوئی نہ رہے گا، اور حالت یہ ہو جائے گی کہ لوگوں کے نزدیک خدا کے حضور ایک سجدہ کر لینا دنیا ومافیہا سے بہتر ہوگا۔''

تھوڑے سے لفظی اختلاف کے ساتھ اس مضمون کی متعدد احادیث صحیح سند کے ساتھ مختلف صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مروی ہیں۔ان تمام احادیث میں ''یکسر الصلیب'' اور ''یقتل الخنزیر'' اور ''یضع الجزیة'' کے جو الفاظ آئے ہیں اس کا مفہوم تھوڑے سے غور وفکر سے سمجھ میں آ جاتا ہے۔صلیب کو توڑنے اور خنزیر کو ہلاک کر دینے کا مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ عیسائیت ایک الگ مذہب کی حیثیت سے ختم ہو جائے گی......حضرت مسیح علیہ السلام اپنے نزول کے بعد خود اعلان فرمائیں گے کہ میں خدا کا بیٹا نہیں، بلکہ اس کا بندہ ہوں ''اِنِّی عَبْدُ اللّٰهِ''......نہ ہی مجھے صلیب پر چڑھایا گیا تھا، بلکہ مجھے میرے ربّ نے آسمان پر زندہ اُٹھا لیا تھا، نہ میں نے خنزیر کو حلال کیا تھا اور نہ ہی میں نے شریعت کو ساقط کیا تھا۔اور ساتھ ہی وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق فرمائیں گے۔نتیجتاً عیسائیت ختم ہو جائے

گی۔اور ''یضع الجزیۃ''یعنی جنگ یا جزیہ کو ختم کر دینے کا مفہوم یہ معلوم ہوتا ہے کہ نزولِ مسیح علیہ السلام کے بعد اُمتوں کا اختلاف ختم ہو جائے گا' دوسرے تمام مذاہب واَدیان بھی مٹ جائیں گے اور سب لوگ ملتِ اسلام میں شامل ہو کر ایک اُمتِ واحدہ بن جائیں گے۔اس طرح نہ جنگ وقتال کی ضرورت باقی رہے گی اور نہ کسی پر جزیہ عائد کیا جائے گا۔ پورے کرۂ ارض پر اللہ کا دین غالب ہو جائے گا اور الصادق المصدوق صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی کے مطابق آسمان سے رحمتیں نازل ہوں گی اور زمین اپنے تمام پوشیدہ خزانے اور برکتیں اُگل دے گی۔

متعدد احادیث کے مطالعے سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام فتنۂ دجال کے فرو کرنے، یہودیوں کا استیصال کرنے' تمام باطل ادیان کو محو اور تمام ملل واُمم کو ملتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں ضم کرنے کے بعد چالیس سال تک اس دنیا میں رہیں گے۔ چنانچہ مسند احمد میں ایک روایت آتی ہے جس میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا دجال کے قصے میں بیان کرتی ہیں کہ ''پھر عیسیٰ علیہ السلام اُتریں گے اور دجال کو قتل کریں گے۔اس کے بعد عیسیٰ علیہ السلام چالیس سال تک زمین میں ایک امامِ عادل اور حاکم منصف کی حیثیت سے رہیں گے۔'' بعض دوسری روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی شادی بھی ہوگی' وہ صاحب اولاد ہوں گے' پھر ان کا انتقال ہوگا اور وہ ''کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ'' کے اٹل قانونِ قدرت سے دوچار ہوں گے' یعنی ان پر بھی طبعی موت واقع ہوگی جیسے ہر ذی نفس پر واقع ہوتی ہے۔ پھر ان کی تدفین بھی اس حجرہ شریف میں ہوگی جس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضورؐ کے دو جاں نثار ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور عمر فاروق رضی اللہ عنہ مدفون ہیں۔

میں نے عرض کیا تھا کہ احادیث نبویہؐ میں قربِ قیامت کے متعلق جو علامات اور پیشین گوئیاں بیان ہوئی ہیں وہ ظاہر ہونی شروع ہوگئی ہیں۔گویا آخری سین کے لیے اسٹیج تیار ہو رہا ہے۔ یہودی جو دنیا کے مختلف ممالک میں منتشر تھے ان کی اسرائیل کے نام سے فلسطین میں ایک آزاد وخود مختار ریاست آج سے تقریباً تینتیس سال قبل قائم ہو چکی ہے (اب اسرائیل کے قیام پر

پینتالیس سال بیت چکے ہیں) جہاں تمام دنیا سے سمٹ سمٹ کر یہودی جمع ہو رہے ہیں۔ ان کا سرمایہ‘ان کی قابلیت‘ ذہانت اور مہارت مجتمع ہو کر عالم اسلام کے لیے ایک خطرہ بن چکی ہے۔ اس خطرے کا عملی مظاہرہ ۱۹۶۷ء کی جنگ میں ہو چکا ہے‘ جس کے نتیجے میں شام‘ اردن‘ لبنان اور مصر کے بہت سے علاقوں پر اسرائیل کا قبضہ ہوا جو آج تک برقرار ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ بیت المقدس پر بھی وہ قابض ہے اور اس کی حرمت اس کے ہاتھوں پامال ہو رہی ہے۔ ظہورِ اسلام کے وقت ان کے دلوں میں اللہ کے آخری رسول ﷺ آخری کتاب‘ آخری اور مکمل دین وشریعت سے جو بغض وعداوت اور حسد پیدا ہوا تھا اس میں روز افزوں اضافہ ہوتا چلا آ رہا ہے‘ حالانکہ یہ اُمویوں‘ عباسیوں‘ فاطمیوں اور عثمانیوں کی مسلم حکومتیں ہی تھیں جنہوں نے یورپ کے متعصب عیسائی حکمرانوں کے جور وستم اور ظلم وتعدّی سے یہودیوں کو نجات دلائی تھی اور جن کی زیر عافیت یہ باقی بھی رہے اور پھلتے پھولتے بھی رہے‘ لیکن ان کا سازشی اور انتقامی ذہن اسلام کی سلامت روی اور انسان دوستی سے بالکل متأثر نہیں ہوا......اسی یہودی ذہن کی کرشمہ سازیاں ہیں جو آج دنیا میں مادہ پرستانہ فکر ونظر کی شدت کی صورت میں ظاہر ہیں۔ عریانی‘ فحاشی اور جنسی بے راہ روی کے جو مناظر آج دنیا دیکھ رہی ہے اس کی ترویج میں بہت بڑا حصہ ان ہی یہودی دانشوروں اور سرمایہ داروں کا ہے۔ یورپ کے متعدد ممالک اور خاص طور پر امریکہ کے ذرائع ابلاغ‘ اخبارات ورسائل‘ ریڈیو‘ ٹی وی اور فلمی صنعت پر زیادہ تر ان ہی کا قبضہ ہے۔ یہی حال بڑی بڑی صنعتوں اور بینکاری کا ہے۔ جن اداروں پر ان کا براہِ راست قبضہ نہیں ہے وہ ان کے زیر اثر ہیں۔ ایوانِ حکومت میں بھی وہ بہت بااثر ہیں۔ کتنے کلیدی عہدے ان کے پاس ہیں۔ علامہ اقبال نے آج سے تقریباً پچاس ساٹھ سال پہلے کہا تھا کہ ع ''فرنگ کی رگِ جاں پنجۂ یہود میں ہے'' تو آج یہ صورت حال زیادہ روشن اور واضح طور پر دنیا کے افق پر نظر آ رہی ہے۔ سود خوری یہود کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہے اور ان کا گوشت پوست اور خمیر اسی حرام کی غذا سے بنا ہے۔ آج اسی یہودی ذہن کی سازش کے باعث

دنیا کی تمام معیشت سودی لین دین کی لعنت میں گرفتار ہے' پھر اس کو فریب اور پُرکاری کا ایسا جامہ پہنا دیا گیا ہے کہ لوگ اس کی مضرتوں کا ادراک کرنے سے یکسر قاصر ہیں۔

اس وقت مشرقِ وسطیٰ جس نازک صورت حال سے دوچار ہے اس پر غور کیجیے۔ بہت سے مسلم ممالک جن میں مصر خاص طور پر قابل ذکر ہے' چار و ناچار امریکہ کی طرف جھکتے چلے جارہے ہیں' اور کچھ ایسا نقشہ جمتا نظر آرہا ہے کہ تیسری عالمی جنگ چھڑنے کا وقت دور نہیں ...... اور اگر یہ جنگ چھڑی تو سب سے بڑا میدانِ جنگ مشرقِ وسطیٰ ہی ہوگا' اور عجب نہیں کہ بیشتر مسلم ممالک خواہی نخواہی امریکہ اور اس کے یورپی اتحادیوں کے دوش بدوش اس جنگ میں شامل ہوں۔ اور دنیا جانتی ہے کہ امریکہ اور اس کے اتحادیوں کی نوے فیصد سے زیادہ آبادی عیسائیوں پر مشتمل ہے۔ گویا احادیث نبویہؐ میں جس عظیم جنگ کی خبر دی گئی تھی کہ ایک زبردست اور خون ریز و تباہ کن جنگ ہوگی جس میں مسلمان اور عیسائی ایک تیسری طاقت کے خلاف متحد ہوں گے' اس کے آثار سامنے نظر آرہے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ اس متوقع ہولناک تباہی کے ظہور میں آنے میں کچھ اور وقت لگے' لیکن موجودہ حالات کی سنگینی بتارہی ہے کہ یہ جنگ اور ٹکراؤ ناگزیر اور اٹل ہے۔ یہودی اس جنگ میں یقیناً امریکہ ہی کے حلیف ہوں گے' کیونکہ امریکہ کی حمایت ہی میں اس سرطان نے مشرقِ وسطیٰ میں اپنے پنجے گاڑے ہیں اور امریکہ ہی اس وقت ان کا سب سے بڑا حامی و مددگار ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں اور عیسائیوں کے دلوں میں متوقع جنگ کے بعد یہودی ہی نفرت کا بیج بونے کا کردار ادا کریں گے اور پھر دجال کی قیادت میں عیسائی مملکتوں کی تائید و اعانت حاصل کرکے مسلمانوں پر یلغار کریں گے اور مسلمان شکست و ہزیمت سے دوچار ہوں گے۔ یہی وقت ہوگا حضرت مسیح علیہ السلام کے نزول کا اور یہی دور ہوگا جب یہودیت کا بالکلیہ استیصال ہوگا اور عیسائی دین اسلام میں داخل ہو جائیں گے اور ساری دنیا میں اسلام کا بول بالا ہوگا اور اللہ ہی کا کلمہ سب سے بلند ہو جائے گا۔ کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ امن و سلامتی کا دور کتنے

سال اور کتنی صدیوں تک رہے گا، لیکن بعض دوسری احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد انسانیت کا قافلہ پھر صراطِ مستقیم اور جادۂ حق سے ہٹ کر شیطان کی بتائی ہوئی پگڈنڈیوں میں بھٹک جائے گا، حتیٰ کہ زمین اللہ تعالیٰ سے بغاوت وسرکشی کی وجہ سے ظلم وستم اور جور وتعدی سے معمور ہو جائے گی، شر غالب ہوگا اور خیر مغلوب ہی نہیں، ناپید اور معدوم ہو جائے گا۔ یہ زوال دنیا کا خاتمہ لے کر آئے گا اور وہ ساعت جس کو ہم قیامت کے نام سے موسوم کرتے ہیں اور جس کی خبر قرآن مجید میں مختلف اسالیب سے دی گئی ہے، آئے گی اور یہ دنیا تہہ وبالا اور ملیا میٹ کر دی جائے گی۔ نظامِ ثقل درہم برہم ہو جائے گا، اس وسیع وعریض کائنات میں پھیلے ہوئے عظیم الشان ستارے اور کُرے ایک دوسرے سے ٹکرا جائیں گے اور یہ عالم تہس نہس ہو جائے گا۔

حاصل کلام یہ کہ یہ کائنات مشیت وحکمت خداوندی کے تحت اپنی اجل مسمّٰی یعنی قیامت کی طرف گامزن ہے اور اس انجام سے لازماً دوچار ہوگی جو اس کا مقدر ہے، لیکن اس انجام کے وقت، سال، سن یا صدی کا تعین کرنا کسی کے لیے ممکن نہیں۔ اس کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے، جیسا کہ سورۂ لقمان کی آخری آیت اور حدیثِ جبریلؑ سے صراحت کے ساتھ ثابت ہے۔ البتہ یہ گھڑی آ کر رہے گی، اس میں شک کرنا کفر ہے۔ پھر اس آخری گھڑی کے آنے تک امت مسلمہ اور بنی نوعِ انسان جن حالات سے دوچار ہوں گے اس کا جو نقشہ احادیث نبویہؐ سے سامنے آتا ہے، اس کو بھی میں نے بیان کر دیا ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اگرچہ قرآن وحدیث میں کسی صدی کے تعین کے ساتھ کوئی خبر نہیں دی گئی ہے، لیکن احادیث میں جو علامات بیان ہوئی ہیں وہ ہم کو چشم سر سے نظر آ رہی ہیں اور صاف نظر آ رہا ہے کہ ہمیں بہت کٹھن مراحل اور سخت امتحانات سے گزرنا ہے، اور یہ محض خام خیالی ہے کہ پندرھویں صدی ازخود ہمارے لیے غلبۂ اسلام کی نوید لے کر آ رہی ہے۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ ابھی اُمت مسلمہ کو کن کن صدموں اور حادثوں سے دوچار ہونا ہے، البتہ اس میں شک نہیں کہ ایک دور لازماً آئے گا جس میں اسلام کا غلبہ ہوگا...... بڑے نصیبے والے

ہوں گے وہ لوگ جو اس غلبۂ اسلام میں حضرت مہدیؒ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زیر قیادت فی سبیل اللہ اور غلبۂ دین حق کے لیے جہاد و قتال میں اپنے جان و مال کی قربانیاں پیش کریں گے' اور بڑے ہی خوش نصیب ہوں گے جو غلبۂ اسلام کے اس دور کا نظارہ بھی سر کی آنکھوں سے کریں گے اور اس کی سعادتوں سے متمتع اور مستفیض بھی ہوں گے۔

(نوٹ: یہاں اب سے بارہ سال قبل کی گزارشات اختتام کو پہنچیں!)

(۷رجون ۱۹۹۳ء)

باب یازدھم

دو شبہات اور اُن کے جواب

ان صفحات میں جو بحث چل رہی ہے اس کے ضمن میں جو مسائل زیر بحث آ رہے ہیں ان کے بارے میں مَیں اپنی یہ تشویش بیان کر چکا ہوں کہ ان سے جدید تعلیم یافتہ طبقہ طبعاً ''الرجک'' ہے اور ان پر بحث و گفتگو کو ضعیف الاعتقادی کا مظہر اور وقت کا ضیاع سمجھتا ہے۔ اس سے قبل یہ بھی عرض کیا جا چکا ہے کہ فتنۂ انکارِ سنت اور استخفافِ حدیث کے زیر اثر نہ صرف جدید تعلیم یافتہ لوگوں کی بہت بڑی تعداد بلکہ بہت سے نوجوان ''علماء'' بھی ان مسائل سے ''غضِ بصر'' اور صرفِ نظر ہی کو مناسب خیال کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان موضوعات پر گفتگو کے سلسلے میں راقم کو کچھ اور ''اندیشے'' بھی تھے کہ اس گفتگو سے کوئی منفی تأثرات نہ لے لیے جائیں!

حال ہی میں راقم کو اپنی متذکرہ بالا تشویش اور اندیشوں کے دو شواہد موصول ہوئے۔ چنانچہ ایک تو خط ہے جو نیویارک سے موصول ہوا۔ مراسلہ نگار پروفیسر میاں ابراہیم ہیں (۲۸۸۔ ایسٹ' سٹریٹ ۸' بروکلن' نیویارک۔ ۱۱۲۱۸) اور اس کے آغاز اور اختتام کے یہ جملے پورے مکتوب کا حاصل اور لب لباب ہیں: ''امید ہے کہ مزاج خوشگوار ہوں گے۔ روزنامہ نوائے وقت میں آپ کے مضامین ''ابراہیمی مذاہبؑ کا ثالث ثلاثہ'' اور ''آنے والے دور کی واضح تصویر'' کا مطالعہ کیا۔ آپ نے تحریر کیا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام قیامت کے قریب دوبارہ زمین پر نازل ہوں گے...... ان مضامین کے لکھنے سے آپ کا مقصد جو کچھ بھی ہو' آپ ہی بہتر جانتے ہیں' لیکن قاری صرف یہ نتیجہ اخذ کرے گا کہ آپ مسلمانوں خصوصاً بوسنیا اور مقبوضہ کشمیر کے لوگوں کو

بشارت دے رہے ہیں کہ ظلم وستم کا ہروار نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ شکر الحمدللہ پڑھ کر برداشت کیے جاؤ۔ قیامت سے قبل ابن مریمؑ تشریف لائیں گے اور ظالموں سے انتقام لے لیں گے!''—— دوسرا منفی ردّعمل ''بالمشافہ'' موصول ہوا۔ اور وہ اس طرح کہ ملتان سے دو نوجوان علماء نے شدّ رحال فرما کر لاہور تشریف لانے کی زحمت گوارا کی' تاکہ مجھے ''مطلع'' کریں کہ میری ان تحریروں سے یہ تأثر عام ہو رہا ہے کہ میں خود ''مہدیٔ موعود'' ہونے کا دعویٰ کرنے والا ہوں۔ لہٰذا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ آگے بڑھنے سے قبل کچھ وضاحتیں ان دو امور کے بارے میں پیش کر دی جائیں۔

ان میں سے جہاں تک مؤخر الذکر بات کا تعلق ہے' اگرچہ اس پر صرف ''اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ'' پڑھ دینا بھی کافی ہے۔ تاہم شاید اس پر مستزاد یہ وضاحت مفید ہو کہ جن احادیث میں یہ خبر دی گئی ہے کہ جب مسلمانانِ عرب پر شدید مصائب کا دَور آئے گا تو اللہ تعالیٰ انہیں ایک مؤمن ومتقی اور باہمت و باصلاحیت قائد عطا فرمائے گا' جو دشمنوں کے مقابلے میں ان کی سپہ سالاری کے فرائض باحسن وجوہ سرانجام دے گا' ان ہی میں یہ صراحت بھی موجود ہے کہ وہ قائد موعود نبی اکرم ﷺ کی عترت یعنی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی اولاد میں سے ہوگا۔ جب کہ میں تو اپنے بارے میں اب سے چھ سات سال قبل اپنی تالیف ''استحکامِ پاکستان اور مسئلہ سندھ'' (صفحات ۱۰۹۔۱۱۲) میں صراحت کر چکا ہوں کہ اگرچہ میری والدہ مرحومہ صدیقی یعنی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی نسل سے تھیں' لیکن میرا ددھیال خالص ہندیُ الاصل ہے۔ چنانچہ میں نے اپنے بارے میں علامہ اقبال کا وہ شعر بھی نقل کیا تھا جو انہوں نے ''ایک فلسفہ زدہ سیدزادے'' سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا۔ یعنی:

میں اصل کا خاص سومناتی آباء مرے لاتی و مناتی

لہٰذا میرے لیے تو یہ دروازہ بند ہے ہی' میرے نزدیک تو آج تک جس ''غیر فاطمی'' نے کبھی مہدیٔ موعود ہونے کے خواب دیکھے یا دعویٰ کیا وہ صریح تضاد کا شکار رہا کہ اس نے

حضرت مہدی کی بشارت تو احادیث نبویؐ سے اخذ کی‘ لیکن ان کے خصائص اور حسب نسب کی ان تفاصیل کو سرے سے نظر انداز کر دیا جو خود اُن احادیث ہی میں وارد ہوئی ہیں۔ رہا عقل و منطق کا معاملہ تو حضرت مہدی کے بارے میں جو خیالات اہل سنت کے ہیں کم از کم ان میں تو کوئی بات نہ عقل کے نزدیک محال ہے‘ نہ عام قوانین طبعی کے خلاف‘ بلکہ اس قانونِ فطرت کے عین مطابق ہے کہ جب فتنہ وفساد حد سے بڑھ جاتا ہے تو بالآخر وہ صورت پیدا ہو جاتی ہے کہ۔

خونِ اسرائیل آ جاتا ہے آخر جوش میں تو ڑ دیتا ہے کوئی موسیٰؑ طلسم سامری!

اس لیے کہ اگر خونِ اسرائیلؑ میں اتنی حرارت تھی تو خونِ اسماعیلؑ اتنا سرد اور عترتِ محمد ﷺ اتنی بانجھ کیوں ہو جائے گی کہ عظیم فتنہ و فساد کے وقت کوئی ہادی ومہدی پیدا نہ کر سکے!

بہر حال‘ راقم کے نزدیک تو ایمان بالرسالت کا تقاضا یہ ہے کہ احادیثِ صحیحہ میں واردشدہ تمام خبروں کو تسلیم کیا جائے‘ خواہ وہ عام عقل انسانی اور اب تک کے دریافت شدہ قوانین طبعی کے خلاف ہی کیوں نہ ہوں‘ لہٰذا حضرت مہدی کے بارے میں کسی شک یا شبہ کا کیا سوال‘ جب کہ ان کے ضمن میں تو کوئی خلافِ عقل یا مخالفِ قوانین طبعی بات کم ازکم احادیثِ نبویہؐ میں موجود نہیں ہے...... تاہم حضرت مہدی کے معاملے میں راقم کی اصل دلچسپی اس حدیث کی بنا پر ہے جس میں یہ خبر دی گئی ہے کہ بلادِ مشرق سے ان کی مدد کے لیے فوجیں جائیں گی۔ (**"یخرُج ناسٌ من المشرق یوطئون للمهدی یعنی سلطانه"** رواہ ابن ماجه عن عبداللّٰه بن الحارث رضی اللہ عنہ)...... تو کاش کہ راقم اور اس کے ساتھی اور جمیع مسلمانانِ پاکستان اپنا تن من دھن اس ارضِ پاکستان میں جو بلادِ عرب کے مشرق میں واقع ہے‘ اسلامی انقلاب برپا کرنے میں کھپا دیں‘ تاکہ نہ صرف اس سر زمین میں جہاں سے ''میر عرب'' ﷺ کو بقولِ اقبال ٹھنڈی ہوا آئی تھی‘ خلافت علیٰ منہاج النبوت کا نظام قائم ہو جائے‘ بلکہ پھر یہیں سے مسلمانانِ عرب کی مدد کا سامان

فراہم ہو سکے...... اور اس طرح اگر ہماری مساعی ان لشکروں کا راستہ صاف کرنے میں کام آ جائیں جو حضرت مہدی کی مدد کے لیے جائیں گے تو ہماری سعادت اور فوز وفلاح کے لیے یہی کافی ہے...... اور جیسا کہ بعد میں تفصیل سے واضح کیا جائے گا' اسرائیل کے وجود میں آنے سے ایک سال قبل پاکستان کا خالص معجزانہ طور پر قیام مشیت ایزدی میں یقیناً اسی کی تمہید ہے......!!

جہاں تک پہلے منفی تأثر کا تعلق ہے تو مختصر ترین الفاظ میں گزارش ہے کہ پیشین گوئیاں صرف احادیث نبویؐ ہی میں بیان نہیں ہوئیں' خود قرآن میں بھی وارد ہوئی ہیں' لیکن ان سے وہ مطلب نکالنا جو پروفیسر ابراہیم صاحب نے نکالا ہے' کسی طرح درست نہیں ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم کی اہم ترین اور نمایاں ترین پیشین گوئی وہ تھی جو سورۃ الروم کے آغاز میں وارد ہوئی' یعنی:

﴿الٓـمّٓ ﴿١﴾ غُلِبَتِ الرُّوْمُ ﴿٢﴾ فِیْٓ اَدْنَی الْاَرْضِ وَھُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ ﴿٣﴾ فِیْ بِضْعِ سِنِيْنَ ۬ؕ لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْۢ بَعْدُ ؕ وَيَوْمَئِذٍ يَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿٤﴾ بِنَصْرِ اللّٰهِ ؕ يَنْصُرُ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَھُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿٥﴾﴾

''ال م۔ قریب کی سرزمین (یعنی شام) میں رومی مغلوب ہو گئے ہیں' اور وہ اس مغلوبیت کے بعد چند ہی سالوں کے اندر اندر دوبارہ غالب آ جائیں گے۔ اللہ ہی کے اختیار میں ہے کل معاملہ پہلے بھی اور بعد میں بھی۔ اور اُس روز اہل ایمان بھی اللہ تعالیٰ کی مدد کے طفیل فرحاں وشاداں ہوں گے۔ اللہ مدد کرتا ہے جس کی چاہتا ہے اور وہ زبردست (اور) رحم فرمانے والا ہے۔'' (آیات ۱ تا ۵' زمانۂ نزول لگ بھگ ۶۱۴ء)

چنانچہ یہ اعجازِ قرآنی کا بہت عظیم مظہر ہے کہ نو ہی سال بعد یعنی ۶۲۳ء میں ایک جانب قیصر روم ہرقل کو ایرانیوں پر فیصلہ کن فتح حاصل ہوئی اور دوسری جانب اہل ایمان کو بھی بدر میں کفارِ مکہ پر عظیم فتح حاصل ہوئی اور اس طرح یہ پیشین گوئی حرف بحرف پوری ہو گئی۔ لیکن ذرا پروفیسر ابراہیم صاحب غور فرمائیں کہ کیا آج سے چودہ سو سال قبل بھی

کسی شخص نے قرآن کی ان آیات سے یہ مطلب نکالا ہوگا کہ ان کے ذریعے قرآن ایک جانب رومیوں کو یہ درس دے رہا ہے کہ نہ صرف یہ کہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہو' بلکہ ایرانیوں کی خدمت میں دست بستہ ''سرِتسلیم خم'' کیے رکھو؟ اور دوسری جانب اہل ایمان کو بھی یہ نصیحت کر رہا ہے کہ کفر اور اہل کفر کے مقابلے کی کوئی سعی کرو نہ جانفشانی اور سرفروشی سے کام لو' بلکہ ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ رہو اور صرف اللہ کی مدد کا انتظار کرتے رہو؟ اور اگر بفرضِ محال کسی نے ان آیاتِ مبارکہ سے یہ مطلب اخذ کیا ہو تو کیا اس کا کوئی الزام قرآن پر آئے گا؟

اسی طرح اگر نبی اکرم ﷺ نے مکی دور کے بھی آغاز ہی میں یہ ''خوش خبری'' دے دی تھی کہ اے مسلمانو! عنقریب قیصر و کسریٰ کے خزانے تمہارے قدموں تلے ہوں گے' تو کیا اس سے مراد یہ تھی کہ تم آرام سے گھروں میں بیٹھے رہو' یہ انقلابِ عظیم از خود اور خود بخود رونما ہو جائے گا؟ ظاہر ہے کہ اس ''پیشین گوئی'' سے یہ مطلب اخذ کرنا نہ اُس وقت درست تھا نہ آج درست ہے!

کاش کہ پروفیسر ابراہیم صاحب اور ان کی طرز پر سوچنے والے تمام حضرات کو معلوم ہو کہ ع ''میری تمام سرگزشت کھوئے ہوؤں کی جستجو'' کے مصداق راقم کی تو پوری زندگی کی سعی و جہد کا مرکزی نقطہ ہی یہ رہا ہے کہ مسلمانوں کو ؎

''خدا نے آج تک اُس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا!''

کے مصداق اپنی حالت بدلنے پر آمادہ کرے' لیکن اس کے لیے ظاہر ہے کہ یہ لازم ہے کہ موجودہ حالات کا صحیح اور حقیقت پسندانہ جائزہ لیا جائے اور ملت کے امراض کی صحیح تشخیص کی جائے' تاکہ صحیح اور مفید و مؤثر علاج تجویز کیا جاسکے۔ اور ایسا نہ ہو کہ پوری توجہ کو صرف ظاہری علامات ہی کے ازالے پر صرف کر کے قیمتی وقت ضائع کر دیا جائے اور اس طرح مہلت اصلاح ختم ہو جائے اور بالآخر سوائے ناکامی و نامرادی کے کچھ ہاتھ نہ

آ سکے۔ چنانچہ جس طرح کبھی علامہ اقبال نے فرمایا تھا: ؎

خوار از مہجوریٔ قرآں شدی　　شکوہ سنجِ گردشِ دوراں شدی

اور:

اے چوں شبنم بر زمیں افتندۂ　　در بغل داری کتابِ زندۂ!

یعنی ''اے اُمت مسلمہ! تو ذلیل وخوار تو اس سبب سے ہوئی ہے کہ تو نے قرآن سے منہ موڑ لیا ہے، لیکن تو شکوہ گردشِ دوراں کا کر رہی ہے!'' اور ''اے وہ قوم جو شبنم کے مانند زمین پر پڑی ہوئی ہے! (اور دشمن تجھے پاؤں تلے روند رہے ہیں) تیری بغل میں وہ کتابِ زندہ موجود ہے (جو تجھے اس ذلت ورسوائی سے رستگاری عطا کر سکتی ہے!)''......

اسی طرح ان گزارشات کے ذریعے اُمتِ مسلمہ کو اس حقیقت کی جانب متوجہ کرنا مقصود ہے کہ ہم اِس وقت درحقیقت اس جرم کی پاداش میں عذابِ الٰہی میں گرفتار ہیں کہ ہم دنیا میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے نمائندے اور اس کے دینِ حق کے علمبردار ہونے کے مدعی ہو کر اپنے عمل کے ذریعے ان سب کی تکذیب کر رہے ہیں۔ اور ؎

''فلک کا جورِ مسلسل جواب دے اس کا　　ہم اپنے حال میں کب انقلاب دیکھیں گے؟''

کے سوال کا صرف ایک جواب ہے اور وہ یہ کہ اس عذابِ الٰہی سے نجات کے حصول کا راستہ صرف یہ ہے کہ ہم ابتداءً کم از کم کسی ایک خطۂ ارضی میں اللہ کے کامل دین حق اور اس کے معتدل اور متوازن نظامِ عدلِ اجتماعی کو بلاکم وکاست قائم کر کے اللہ کی نمائندگی کا حق ادا کر دیں اور اس طرح شہادت علی الناس کی اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہوں جس کے لیے ہمیں بحیثیت اُمت برپا کیا گیا تھا۔ اور ع ''گر یہ نہیں تو بابا پھر سب کہانیاں ہیں!'' کے مصداق اگر ہم اس بنیادی جرم سے باز نہیں آتے اور اس اصل کوتاہی کی تلافی نہیں کرتے تو نہ امریکہ کی کاسہ لیسی ہمارے امراض کا ازالہ کر سکتی ہے نہ کوریا کی نقالی ہماری ترقی اور استحکام کی ضمانت دے سکتی ہے۔ اس لیے کہ ؎

''اپنی ملّت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر　　خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمیؐ!''

کے مطابق اُمتِ مسلمہ کا معاملہ دنیا کی دوسری قوموں کی طرح نہیں، بلکہ ہر اعتبار سے منفرد اور مختلف ہے۔

اب اس سے پہلے کہ کتب حدیث کے ''ابواب ملاحم''، یعنی تاریخ انسانی کے آخری دور میں پیش آنے والی عظیم اور تباہ کن جنگوں کے سلسلے کے تذکرہ پر مشتمل ابواب کی چند اہم احادیث اور ان میں سے خاص طور پر ایسی احادیث کا تذکرہ کیا جائے جن میں وارد شدہ پیشین گوئیوں کا عالمِ واقعہ میں ظہور بالکل ایسے انداز میں شروع ہو چکا ہے جیسے صبح طلوع ہوتی ہے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہ واضح کر دیا جائے کہ عالم مادّی میں وہ عظیم جنگیں جن اسباب کی بنا پر ظہور میں آئیں گی ان سے قطع نظر مشیت ایزدی میں ان کی غرض و غایت کیا ہو گی؟

یہ بات ان احادیث سے تو صراحت کے ساتھ معلوم ہوتی ہی ہے کہ ان جنگوں کا میدان مشرقِ وسطٰی بنے گا، عالمی حالات اور واقعات بھی ایک عرصہ سے اسی جانب اشارہ کر رہے ہیں کہ آئندہ جنگ عظیم یعنی اس صدی کی تیسری عالمگیر جنگ یورپ میں نہیں مشرقِ وسطٰی میں لڑی جائے گی۔ اس لیے بھی کہ یورپ دو عالمگیر جنگوں کی تباہی برداشت کر کے اب اتنا ''سمجھ دار'' ہو گیا ہے کہ تیسری جنگ کا میدان اپنے علاقے کو نہیں بننے دے گا، اور اس لیے بھی کہ عہد حاضر کی سب سے زیادہ قیمتی متاع یعنی تیل کے عظیم ترین ذخائر اسی علاقے میں ہیں جسے بجا طور پر سیّال سونا کہا جاتا ہے۔

اب ظاہر ہے کہ اس علاقے میں موجودہ اُمت مسلمہ یعنی اُمت محمد ﷺ کا افضل تر حصہ یعنی ''اُمّیین'' یا عرب مسلمان تو چودہ سو برس سے آباد ہیں ہی، اس صدی کے آغاز سے سابقہ اور معزول شدہ اُمت مسلمہ یعنی یہودیوں کی بھی از سر نو آبادکاری زور وشور کے ساتھ شروع ہو گئی تھی، جو عنقریب اپنے کلائمیکس کو پہنچ جائے گی اور پوری دنیا سے تمام یہودی کشاں کشاں یہیں آ کر آباد ہو جائیں گے۔ چنانچہ ان عظیم جنگوں یا سلسلۂ ملاحم کے ذریعے ہولناک تباہی کی صورت میں اللہ کے قانونِ عذاب کے مطابق شدید ترین کوڑے

ان ہی دونوں پر پڑیں گے' لیکن ان کے مابین بالآخر ایک عظیم فرق وتفاوت ظاہر ہوگا۔ یعنی سابقہ معزول' مغضوب اور ملعون اُمت یعنی یہود پر تو اللہ کے اس ''عذابِ اکبر'' کے فیصلے کا نفاذ ہوگا جس کی مستحق وہ حضرت مسیح علیہ السلام کے کفر اور آنجناب ؑ کو اپنے بس پڑتے سولی پر چڑھوا دینے کی بنا پر اب سے دو ہزار برس قبل ہو چکی تھی' لیکن جس کے نفاذ کو ایک خاص سبب سے مؤخر کر دیا گیا تھا' چنانچہ اب اسے ان ہی حضرت مسیح علیہ السلام کے ذریعے اور مسلمانوں کے ہاتھوں نسیاً منسیاً اور نیست و نابود کر دیا جائے گا' بالکل جیسے حضراتِ نوح' ہود' صالح' لوط اور شعیب علیہم السلام کی اقوام اور آلِ فرعون اپنی اپنی جانب بھیجے جانے والے رسولوں کی نگاہوں کے سامنے ہلاک کیے گئے تھے۔ لیکن اس کے برعکس چونکہ موجودہ اُمتِ مسلمہ اللہ کے آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت ہے اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قول کے مطابق خود آخری اُمت کی حیثیت رکھتی ہے' مزید برآں وہ صرف ایک نسل پر مشتمل نہیں بلکہ ''ملٹی نیشنل'' اُمت ہے' لہٰذا اسے اس کے جرائم کے بقدر سزا دینے کے بعد توبہ کی توفیق اور اصلاح کا موقع عنایت کر دیا جائے گا جس سے اسلام کی نشأۃ ثانیہ اور دین حق کے غلبے کا دورِ ثانی شروع ہوگا' جو اس بار پورے عالم انسانی اور کل روئے ارضی کو محیط ہوگا' جس کی صریح اور واضح خبریں دی ہیں جناب صادق و مصدوق صلی اللہ علیہ وسلم نے' اور جس کی کوئی ادنیٰ جھلک اور دھندلی تصویر دیکھ لی تھی چودھویں صدی ہجری کے نابغہ اور وِژنری علامہ اقبال نے جس پر وہ خود بھی حیرت واستعجاب کی تصویر بن کر رہ گئے تھے کہ:۔

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں
محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی!

اور:۔

شب گریزاں ہو گی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہو گا نغمۂ توحید سے!

اور یہ غالباً صرف اس افضل ترین اُمت کے بھی افضل تر حصے کی سزا میں ایک

انگریزی محاورے کے مطابق ’’تکلیف پر توہین کے اضافے‘‘ (To add insult to injury) کی غرض سے ہوا ہے کہ ایک مغضوب وملعون اور "Condemned" قوم کو دو ہزار سال تک باقی بھی رکھا گیا اور پھر عارضی طور پر سنبھالا بھی دیا گیا (اگرچہ اس کے لیے یہ مرنے والے مریض کے آخری سنبھالے یا بجھنے والی شمع کی آخری بھڑک کی حیثیت رکھتا ہے)‘ تاکہ موجودہ اُمتِ مسلمہ کے افضل ترین حصے کو اس کے ہاتھوں پٹوا کر گویا وہ صورت پیدا کر دی جائے جو یو پی کے دیہات میں اختیار کی جاتی ہے‘ یعنی یہ کہ کسی شخص کی سزا میں توہین و تذلیل کا عنصر شامل کرنے کے لیے اسے کسی چمار کے ہاتھوں جوتے لگوائے جاتے ہیں۔ واللہ اعلم!

(۱۵/ جون ۱۹۹۳ء)

باب دوازدھم

خلیج کی جنگ: ''جنگوں کی ماں؟''

آج سب سے پہلی تو یہ وضاحت ضروری ہے کہ گزشتہ جمعہ کے کالم میں حضرت مہدی کے نام کے ساتھ ہر جگہ ''علیہ السلام'' کی مخفف علامت '' ''' درج ہوئی ہے۔ یہ ادارۂ نوائے وقت کے کسی کارکن کے حسن عقیدت کی مظہر ہے' جو میرے مسودے میں موجود نہیں تھی۔ میرے نزدیک اگرچہ خالص لغوی اور لفظی اعتبار سے تو جب ہم مسلمان ایک دوسرے سے ملاقات کے موقع پر ''السلام علیکم'' کہتے ہیں تو یقیناً کسی زندہ یا فوت شدہ مسلمان کے لیے ''علیہ السلام'' کے الفاظ بھی استعمال کیے جاسکتے ہیں۔ بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر چونکہ قرآن حکیم میں اہل ایمان سے خطاب کر کے کہا گیا ہے: ﴿هُوَ الَّذِیْ یُصَلِّیْ عَلَیْكُمْ﴾ (الاحزاب:۴۳) یعنی اے اہل ایمان! ''اللہ تم پر اپنی رحمتیں نازل فرماتا رہتا ہے'' تو اس پر قیاس کرتے ہوئے کسی بھی حاضر و موجود مسلمان سے ''صلی اللہ علیک'' اور فوت شدہ یا غیر موجود مسلمان کے لیے ''صلی اللہ علیہ'' کے دعائیہ الفاظ کہے جاسکتے ہیں۔ لیکن اُمت کے تعامل یا دستور اور روایت کے تحت ''صلی اللہ علیہ وسلم'' کے الفاظ صرف نبی اکرم ﷺ کے لیے' ''علیہ السلام'' بقیہ جملہ انبیاء اور رسولوں کے لیے' ''رضی اللہ عنہ'' صحابہؓ کے لیے' ''رحمۃ اللہ علیہ'' بقیہ جملہ بزرگانِ دین اور ائمہ علم و ہدایت کے لیے اور ''مرحوم'' عام مسلمانوں کے لیے مخصوص ہو گئے ہیں' اور ان کے استعمال کے معاملے میں ع ''گر حفظ مراتب نہ کنی زندیقی!'' کے پیشِ نظر احتیاط لازمی ہے۔ اس معاملے میں اہل تشیع کا اپنا جداگانہ معمول ہے جو ان کے عقائد پر مبنی ہے۔ وہ چونکہ ائمہ اہل بیت کو ''معصوم'' قرار دیتے ہیں جس کے نتیجے میں ان کا رتبہ انبیاء کرام علیہم السلام سے بہت قریب ہو جاتا ہے' لہٰذا وہ ان کے لیے ''علیہ السلام'' کے الفاظ

استعمال کرتے ہیں۔ اور چونکہ ان کے نزدیک ''مہدیٔ موعود'' سے مراد اُن کے بارھویں امام یعنی حضرت حسن عسکریؒ کے صاحبزادے محمد المہدیؒ ہیں' جن کی ولادت تیسری صدی ہجری میں ہوئی تھی اور جو اُن کے قول کے مطابق اُس وقت سے تاحال روپوش (غائب) ہیں اور قیامت کے قریب ''ظاہر'' ہوں گے' لہٰذا وہ ان کے نام کے ساتھ ''علیہ السلام'' لکھتے ہیں۔ جب کہ اہل سنت کے نزدیک حضرت مہدی اگرچہ ہوں گے تو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی اولاد ہی میں سے' لیکن ان کی پیدائش قیامت کے قریب عام انسانوں کی طرح عبداللہ نامی شخص کے گھر میں ہوگی' اور وہ ''سلسلۂ ملاحم'' کے پُر آشوب دَور میں مسلمانانِ عرب کی رہنمائی اور سپہ سالاری کے فرائض سرانجام دیں گے۔

اور اب آیئے اصل مضمون کی طرف۔ اس دنیا کے خاتمے سے قبل عالمی غلبۂ اسلام اور پورے کرۂ ارضی پر خلافت علیٰ منہاج النبوت کے قیام کو میں نصوصِ شرعیہ میں سے قرآن حکیم سے دلالت نص کی بنیاد پر' اور احادیث نبویہؐ سے صراحت نص کی اساس پر ثابت کر چکا ہوں۔ مزید برآں علامہ اقبال کے ''وژن'' کے علاوہ اس کی عقلی اور سائنسی دلیل بھی علامہ اقبال کے فلسفۂ خودی کے سب سے بڑے شارح اور اقبال اکیڈمی کے اوّلین ڈائریکٹر ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم کے نظریۂ ارتقاء سے استشہاد کے حوالے سے بیان ہو چکی ہے۔ رہا ان عظیم واقعات وحوادث کا معاملہ جن کی خبریں اس سے متصلاً قبل کے دور کے ضمن میں احادیث نبویہؐ میں وارد ہوئی ہیں' تو ان میں سے بھی سوائے ایک یعنی نزولِ مسیحؑ کے اور کوئی بات نہ خلافِ عقل وقیاس ہے نہ مخالف قوانین طبعی۔

چنانچہ جب اس بیسویں صدی عیسوی کے دوران اس سے قبل دو عظیم جنگیں ایسی واقع ہو چکی ہیں جن کا سلسلہ کئی کئی سال تک جاری رہا' اور جن سے بڑے بڑے ملک بھی تہس نہس ہوئے اور کروڑوں کی تعداد میں انسان بھی قتل یا معذور ہوئے' تو کون سی قابلِ تعجب اور خلافِ عقل بات ہو گی اگر ایک تیسری عظیم جنگ بھی واقع ہو جس کا میدان مشرقِ وسطیٰ کے عرب ممالک بنیں' اور اس کا سلسلہ بھی کئی سالوں کو محیط اور کئی اَدوار پر

مشتمل ہو۔ اور اس کے نتیجے میں جہاں عظیم تعداد میں عرب مسلمان بھی قتل ہوں وہاں ان یہودیوں کا تو بالکل ہی قلع قمع ہو جائے جو دنیا کے کونے کونے سے وہاں آ کر آباد ہو رہے ہیں۔

اسی طرح تاریخ انسانی میں بارہا ایسا ہوا ہے کہ جب کسی قوم یا ملک کے حالات انتہائی ابتر ہو جاتے ہیں تو ؎

''خونِ اسرائیلؑ آ جاتا ہے آخر جوش میں
توڑ دیتا ہے کوئی موسیٰؑ طلسمِ سامری!''

کے مصداق بظاہر مردہ اور از کار رفتہ قوم میں سے بھی دفعۃً کوئی عظیم شخصیت ایسی ابھر آتی ہے جو قوم کے تن مردہ میں نئی روح پھونک دیتی ہے اور ع ''لڑا دے ممولے کو شہباز سے!'' کے مصداق نحیف و ناتواں اور کم ہمت اور بے حوصلہ لوگوں کو بھی عظیم قوتوں سے مقابلے کے لیے کھڑا کر دیتی ہے۔ تو کون سے تعجب کی بات ہے اگر انتہائی ناگفتہ بہ حالات میں ''خونِ اسمٰعیلؑ'' بھی جوش میں آ جائے اور ؎

''کتابِ ملتِ بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے
یہ شاخِ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگ و بر پیدا!''

کے مطابق اولادِ فاطمہؓ کی شاخ پر کوئی گل سر سبد کھل اٹھے؟

تاہم آج سے ساڑھے بارہ سال قبل جب میں نے پندرہویں صدی ہجری کے متوقع حوادث و واقعات کے موضوع پر تقریر کی تھی تو خود مجھے ہرگز اندازہ نہیں تھا کہ ان کا سلسلہ اس قدر جلد شروع ہو جانے والا ہے۔ مزید برآں جس حدیث نبویؐ کی بنیاد پر میں نے یہ بات کہی تھی کہ قیامت کے قریب پیش آنے والی عظیم جنگوں کا پہلا دور اس طور سے شروع ہو گا کہ مسلمان اور عیسائی متحد ہو کر کسی تیسری قوت کے خلاف جنگ کریں گے جس میں انہیں فتح حاصل ہو گی، وہ سنن ابی داؤدؒ کی کتاب الملاحم میں حضرت ذومخبر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور اس کے ابتدائی الفاظ یہ ہیں: ''عنقریب تم رومیوں (یعنی عیسائیوں)

سے بھرپور صلح کرو گے اور پھر وہ اور تم متحد ہو کر ایک ایسے دشمن کے خلاف جنگ کرو گے جو تمہارے عقب میں واقع ہو گا۔ پھر تمہاری مدد ہو گی' چنانچہ تم غنیمت حاصل کرو گے اور خود سلامت رہو گے!'' اور اُس وقت گمانِ غالب یہ تھا کہ اس جنگ میں ایک جانب امریکہ کی سربراہی میں یورپ کی جملہ عیسائی حکومتیں اور اکثر مسلمان ملک خصوصاً عرب حکومتیں ہوں گی اور دوسری جانب روس اور اس کے طفیلی ممالک ہوں گے۔ اور اُس وقت یہ خیال تک نہ ہوسکتا تھا کہ اس وقت سوویت یونین تو ع ''یہی ہے مرنے والی اُمتوں کا عالم پیری!'' کا نقشہ پیش کر رہی ہو گی' اور وہ تیسری طاقت عین جزیرہ نمائے عرب کے ''عقب'' میں واقع ہو گی' یعنی صدام حسین کی سربراہی میں عراق کی بعثی حکومت! حالانکہ نہایت مستند احادیث میں یہ ذکر موجود ہے کہ ایک وقت آئے گا کہ عراق میں سونے کا خزانہ یا پہاڑ برآمد ہو جائے گا جس کی وجہ سے وہاں نہایت خون ریز اور خوفناک جنگ ہو گی' لیکن چونکہ ان احادیث کے متن میں کوئی لفظی تعلق قیامت سے قبل کے سلسلۂ ملاحم کے ساتھ موجود نہیں ہے' لہٰذا ان میں وارد خبر کو ایک جداگانہ اور مستقل بالذات معاملہ سمجھا گیا۔

لیکن اب جب کہ الفاظِ قرآنی ﴿اِذَا وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ﴾ کے مصداق وہ واقعہ ظہور پذیر ہو چکا ہے' ان احادیث نبویہؐ کی عظمت بھی اظہر من الشّمس ہو گئی ہے کہ:

(۱) صحیح بخاریؒ اور صحیح مسلمؒ میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''گمان ہے کہ فرات سے سونے کا ایک خزانہ برآمد ہو جائے گا!'' اور

(۲) صحیح مسلمؒ میں حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''گمان ہے کہ فرات سے سونے کا ایک پہاڑ برآمد ہو جائے گا۔ چنانچہ جب لوگ اس کے بارے میں سنیں گے تو اس پر ٹوٹ پڑیں گے۔ تو جو لوگ اس کے پاس ہوں گے وہ سوچیں گے کہ اگر ہم نے انہیں چھوڑ دیا تو وہ ساری دولت لے جائیں گے۔ پھر اس پر جنگ کریں گے یہاں تک کہ ننانوے فیصد لوگ ہلاک ہو جائیں گے!'' (ان احادیث کو

پڑھتے ہوئے یہ بات پیشِ نظر رہے کہ قدیم زمانے میں ملکوں اور علاقوں کو دریاؤں یا پہاڑوں یا بڑے شہروں کے نام سے موسوم کرنے کا رواج عام تھا!) تو ذرا غور فرمائیں کہ کیا یہ بات محض ''اتفاقی'' ہے اور عظمت حدیث کی دلیل نہیں کہ آج تیل کی دولت کو ''سیّال سونا'' قرار دیا جا رہا ہے؟ پھر کیا یہ واقعہ نہیں کہ خلیج کی جنگ کا اصل باعث یہی تیل کی دولت ہے؟ مزید برآں کیا یہ امر قابل توجہ نہیں ہے کہ عراق کے صدر صدام حسین نے اس جنگ کو ''اُمّ المحارب'' یعنی جنگوں کی ماں یا جنگوں کے سلسلے کا نقطۂ آغاز قرار دیا؟ (واضح رہے کہ صدام حسین خواہ اپنی ذاتی حیثیت میں دینی اعتبار سے کتنی ہی ناپسندیدہ شخصیت' اور مسلمانوں اور اسلام کے حق میں اسم با مسمّٰی یعنی ''صد+ دام'' یعنی سوداموں یا جالوں کی حیثیت رکھتا ہو' بہرحال عرب ہونے کے ناتے قرآن سے بھی واقف ہے اور حدیث نبویؐ سے بھی۔ یہی وجہ ہے کہ دسمبر ۱۹۹۰ء میں مَیں نے اس کا جو طویل انٹرویو لاس اینجلس میں سی این این پر دیکھا تھا' جو ایک نہایت ماہر و شاطر شخص جان رادر نے لیا تھا' اس کے موقع پر میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا تھا کہ اس کی پشت پر جو طغریٰ آویزاں تھا وہ سورۃ الانبیاء کی آیت ۱۸ کے اس حصے کا تھا: ﴿بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهُ فَإِذَا هُوَ زَاهِقٌ﴾ یعنی ''ہم حق کا کوڑا باطل کے سر پر دے مارتے ہیں جو اُس کے دماغ کا بھرکس نکال دیتا ہے اور اس طرح باطل نیست و نابود ہو جاتا ہے!'')۔

رہی یہ بات کہ ننانوے فیصد کی ہلاکت کی بات صحیح ثابت نہیں ہوئی' تو اوّلاً اس کا بھی امکان ہے کہ وہ الفاظ کسی خاص محاذ سے متعلق ہوں' مثلاً' جیسے کہ سب کو معلوم ہے' کویت سے پسپا ہونے والی عراقی فوج کا جو حشر ہوا اس پر تو یہ الفاظ پوری طرح منطبق ہوتے ہیں۔ اور ثانیاً ابھی عراق کا معاملہ ختم کہاں ہوا ہے؟ ابھی تو صدام حسین امریکہ اور اس کے حواریوں کے حلق میں پھنسی ہوئی ہڈی بنا ہوا ہے کہ نہ اگلی جائے نہ نگلی جائے! (اس لیے کہ اس کے خاتمے کا مطلب اس پورے علاقے کو ایران کے حلقۂ اثر میں دے دینا ہوگا!) تو کون سے تعجب کی بات ہوگی اگر کسی آئندہ راؤنڈ میں امریکہ اور

اس کے اتحادی دو سال قبل کی وحشیانہ بمباری سے بھی سو گنا زیادہ پیمانے پر بمباری کریں اور کسی خاص شہر یا علاقے میں تباہی اس درجہ کی ہو جائے جس کا نقشہ حدیث نبویؐ میں سامنے آتا ہے! اس لیے کہ خلیج کی جنگ سے یہ حقیقت واضح ہو چکی ہے کہ امریکہ اور اس کے حواری ہر ممکن کوشش کریں گے کہ ان کے کسی ایک سپاہی کو بھی کوئی گزند نہ پہنچے خواہ دشمن کا بچہ بچہ ہلاک ہو جائے۔

اس موقع پر اس امر کا ذکر بھی دلچسپی کا موجب ہوگا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواری حضرت یوحنا کے مکاشفات میں بھی، جو بائبل کے عہد نامۂ جدید کی آخری کتاب میں درج ہیں، عراق کی ایسی ہی شدید تباہی کا ذکر بتکرار و اعادہ موجود ہے۔ ان مکاشفات میں عراق کو ''بڑے شہر بابل'' کے نام سے موسوم کیا گیا ہے، اور سب سے حیران کن امر یہ ہے کہ اس ''شہر'' کے تین ٹکڑے ہو جانے کی نہایت واضح الفاظ میں خبر دی گئی ہے۔ (دیکھئے کتاب ''مکاشفات'' کے باب ۱۶ کی آیات ۱۸، ۱۹) اور آج یہ حقیقت نگاہوں کے سامنے موجود ہے کہ عراق بالفعل تین حصوں میں تقسیم ہو چکا ہے۔ چنانچہ شمال میں کردستان تقریباً خود مختار ہو چکا ہے اور جنوبی علاقے کو ''نو فلائی زون'' قرار دے کر عملاً عراق کی حکومت کے کنٹرول سے آزاد کر دیا گیا ہے، اور صرف بقیہ درمیانی علاقے پر حکومت بغداد کی واقعی عملداری باقی رہ گئی ہے۔

اسی طرح آج سے ساڑھے بارہ سال قبل خود میرے لیے یہ بات ناقابل قیاس تھی کہ دنیا میں پھر کوئی ''صلیبی جنگ'' چھڑ سکتی ہے اور سند کی بنیاد پر حدیث نبویؐ پر اعتماد کے باوجود مغربی دنیا کے عام سیکولر مزاج کے باعث یہ بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ جن ''ملاحم'' یعنی جنگوں کی احادیث میں خبر دی گئی ہے ان کا دوسرا دور ''مذہبی'' اساس پر ہوگا۔ لیکن اب یہ حقیقت چشم سر کے سامنے موجود ہے کہ بوسنیا ہرزیگووینا سے ایک ''صلیبی جنگ'' کا بالفعل آغاز ہو چکا ہے۔ یادش بخیر، یہ بیسویں صدی عیسوی اس اعتبار سے بہت عجیب ہے کہ اس کے آغاز میں بھی ایک عظیم الشان سلطنت یعنی سلطنت عثمانیہ کا

خاتمہ ہوا اور ایک چھوٹے سے ملک ترکی کے سوا دنیا کے نقشے سے اس کا نام ونشان مٹ گیا‘ اور اختتام پر بھی ایک عظیم سلطنت یعنی سوویت یونین نسیاً منسیّا ہوگئی۔ اسی طرح اس کی پہلی دہائی میں بھی ایک جنگِ بلقان ہوئی تھی جو پہلی عالمگیر جنگ کی تمہید بنی تھی اور آخری دہائی میں بھی دوسری جنگ بلقان شروع ہو چکی ہے جو احادیث نبویؐ میں وارد پیشین گوئی کے مطابق تیسری عالمگیر جنگ کا نقطۂ آغاز ثابت ہوگی۔ واللہ اعلم!

اہل مغرب سیاسی نظریے کی حیثیت سے سیکولرزم کے ساتھ اپنی تمام تر وابستگی اور تہذیب وثقافت کے اعتبار سے اپنی مبینہ رواداری اور وسیع المشربی کے باوجود تا حال جذباتی اور نفسیاتی سطح پر جس مذہبی عصبیت ہی نہیں تعصب میں مبتلا ہیں اس کا ایک نمایاں مظہر تو یہ ہے کہ ترکی اپنے آپ کو مغربی تہذیب وتمدن میں پوری طرح رنگ دینے اور سیکولرزم کو نہ صرف عملاً اختیار کرنے بلکہ دستور وآئین کی سطح پر اسے مضبوط ترین تحفظات عطا کرنے اور اس طرح گویا ع ’’میرے اسلام کو اک قصۂ ماضی سمجھو!‘‘ پر پوری طرح عمل پیرا ہو جانے کے باوجود تا حال یورپ کی ’’مس کامن مارکیٹ‘‘ کو ع ’ہنس کے وہ بولی کہ پھر مجھ کو بھی راضی سمجھو!‘‘ پر آمادہ نہیں کر سکا۔ اور دوسرا اہم مظہر‘ جس کی جانب اکثر مسلمانوں کی توجہ اس بنا پر نہیں ہوئی کہ وہ خود اپنی تاریخ سے بے خبر ہیں‘ یہ ہے کہ سال ۱۹۹۲ء کو پوری مغربی دنیا نے ’’اسپین کا سال‘‘ قرار دے کر جوش وخروش سے منایا۔ چنانچہ پورا ملک دلہن کی طرح سجایا گیا اور ورلڈ اولمپک وہاں رکھ کر پوری دنیا کو وہاں آنے کی دعوت دی گئی‘ تاکہ دنیا بھر کے لوگ ان کے جشنِ مسرت میں شریک اور ان کی مسرت وشادمانی کی شدت کا مشاہدہ کر سکیں...... اور یہ سب کچھ اس لیے کیا گیا کہ چونکہ ۱۴۹۲ء سقوطِ غرناطہ کا سال تھا‘ لہٰذا ۱۹۹۲ء میں سپین سے اسلام اور مسلمانوں کے خاتمے کو پورے پانچ سو سال مکمل ہو گئے تھے! اس سے بھی بڑھ کر قابلِ غور بات یہ ہے کہ خلیج کی جنگ کے بعد عرب اسرائیل مذاکرات کے لیے میڈرڈ کو کیوں منتخب کیا گیا‘ جہاں اس سے قبل کبھی کوئی بین الاقوامی کانفرنس منعقد نہیں ہوئی تھی؟ کیا اس سوال کا کوئی جواب اس کے سوا ممکن ہے کہ عربوں کو اسرائیل کے ساتھ

ایک میز پر بیٹھنے کی ''ذلت'' کے ساتھ ساتھ بقولِ اقبال ''تہذیب حجازی کے مزار'' کی زیارت کرانی مقصود تھی؟

اور اس ''صغریٰ'' پر اضافہ کر لیجیے اس ''کبریٰ'' کا کہ کمیونزم کے زوال اور سوویت یونین کے خاتمے کے بعد پوری مغربی دنیا نے ''مسلم فنڈامنٹلزم'' کو اپنے لیے خطرہ نمبر ایک قرار دے لیا ہے۔ چنانچہ مغربی آقاؤں کی زیر ہدایت مصر اور الجزائر میں تو احیاء اسلام کے علمبرداروں پر تعذیب وتشدد کی بھٹی دہک ہی چکی ہے' سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات میں بھی تحقیق وتفتیش اور دارو گیر کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے' اور کوئی عجب نہیں کہ اس پر ردّعمل کے طور پر دینی مزاج کے حامل عرب نوجوان بالخصوص وہ جن کے احیائی جوش اور جذبے کو جہادِ افغانستان نے زبردست مہمیز دے دی ہے' مشتعل ہو کر بے قابو ہو جائیں اور کوئی عظیم ہنگامہ برپا ہو جائے' جس کی گرما گرمی میں کسی مقام پر وہ واقعہ بھی پیش آ جائے جس کا ذکر سنن ابی داؤدؒ کی محولہ بالا روایت میں ہے' یعنی:
(عیسائیوں کے ساتھ مل کر ایک مشترک دشمن کے خلاف جنگ اور اس پر فتح حاصل ہونے کے بعد) ''پھر تم واپس آؤ گے اور ایک ٹیلوں والے نخلستان میں پڑاؤ کرو گے تو نصرانیوں میں سے ایک شخص اُٹھ کر صلیب بلند کرے گا اور کہے گا کہ صلیب غالب آ گئی۔ اس پر مسلمانوں میں سے ایک شخص غضب ناک ہو کر صلیب کو توڑ ڈالے گا۔ اس پر رومی (عیسائی) صلح ختم کر دیں گے اور بڑی جنگ کے لیے جمع ہو جائیں گے!'' واضح رہے کہ اس قسم کے واقعات بسا اوقات بارود کو چنگاری دکھانے کے مترادف بن جایا کرتے ہیں ...... اور جاننے والے جانتے ہیں کہ ایسا کوئی واقعہ نجد کے شمال مشرقی علاقے میں' جو امریکہ کے فوجی اڈے کی حیثیت اختیار کر چکا ہے' کسی بھی وقت رونما ہو سکتا ہے۔

قصہ مختصر' ایک عظیم ''صلیبی جنگ'' کے لیے میدان تیزی کے ساتھ ہموار ہو رہا ہے' جو احادیثِ نبویہؐ کے مطابق بہت طویل ہو گی اور جس کے کئی مراحل ہوں گے' جن کی تفصیل یہاں ممکن نہیں۔ البتہ ایک بات کا تذکرہ مناسب معلوم ہوتا ہے اور وہ یہ کہ ان

کے دوران ایک جنگ جسے ''الملحمة العظمٰی'' قرار دیا گیا ہے، نہایت عظیم اور حد درجہ خوفناک ہوگی۔ (اس موضوع پر ایک نوجوان محقق قاضی ظفر الحق نے نہایت عرق ریزی کے ساتھ تحقیق کی ہے۔ چنانچہ ان کا ایک مضمون گزشتہ سال آٹھ اقساط میں ''ندائے خلافت'' میں شائع کیا گیا تھا جو ہنوز نامکمل ہے۔ مکمل ہونے پر اسے اِن شاء اللہ کتابی صورت میں شائع کر دیا جائے گا۔) تاہم اس کا اصل حاصل اور لبِّ لباب یہ ہے کہ ان جنگوں کے دوران شدید جانی و مالی نقصانات کی صورت میں اُمت مسلمہ کے افضل اور برتر حصے یعنی مسلمانانِ عرب کو اُن کے اس اجتماعی جرم کی بھرپور سزا مل جائے گی جس کا ارتکاب انہوں نے دینِ حق کے نظامِ عدل وقسط کو ایک کامل نظامِ زندگی کی صورت میں قائم نہ کر کے کیا ہے۔ ان جنگوں میں ایک مرحلے پر ''دارالاسلام'' صرف حجاز تک محدود ہو کر رہ جائے گا اور دشمن مدینہ منورہ کے ''دروازوں'' تک پہنچ جائے گا۔ لیکن پھر رحمتِ خداوندی جوش میں آئے گی، مسلمانانِ عرب ایک نئی ہیئت اجتماعی تشکیل دیں گے اور ایک نئے قائد وامیر محمد بن عبداللہ المہدی کے ہاتھ پر ''بیعت'' کر کے جوابی کارروائی کے لیے مستعد ہو جائیں گے۔

اس موقع پر بھی یہ تذکرہ یقیناً دلچسپی کا موجب ہوگا کہ عیسائیوں کی روایات میں بھی اس دنیا کے خاتمے سے قبل ایک عظیم جنگ کا ذکر موجود ہے جو حق اور باطل کے مابین ہوگی۔ چنانچہ حضرت یوحنا کے جن مکاشفات کا تذکرہ اس سے قبل ہو چکا ہے ان ہی میں نہ صرف یہ کہ اس جنگ کا ذکر بھی موجود ہے، بلکہ یہ صراحت بھی ہے کہ اس میں حصہ لینے کے لیے ''مشرق کے بادشاہوں کی فوجیں'' بھی آئیں گی! مکاشفات میں اس جنگ کے دن کو ''خدائے اعظم وقادر کا دن'' کہا گیا ہے اور اس کے محل وقوع کا نام ''آرمیگاڈان'' بتایا گیا ہے۔ (دیکھئے ''مکاشفات'' باب ۱۶، آیات ۱۲ تا ۱۶) گویا حدیث نبویؐ کا ''الملحمة العظمٰی'' اور بائبل کا ''آرمیگاڈان'' ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں!

احادیثِ نبویہؐ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان جنگوں کے پہلے مرحلوں میں مقابلہ

صرف عیسائیوں اور مسلمانوں کے مابین ہوگا' اور یہودی اگرچہ پس پردہ تو شریک ہوں گے لیکن سامنے نہیں آئیں گے۔ چنانچہ خلیج کی جنگ کے دوران اس صورتِ حال کی بھی ایک ابتدائی جھلک دنیا کے سامنے آ چکی ہے کہ امریکہ اور اس کے حواریوں نے اسرائیل کو جنگ میں شرکت سے روکے رکھا اور اس کی حفاظت کی ذمہ داری خود پوری کی۔ (چنانچہ اتحادی افواج کے کمانڈر انچیف جنرل شوارزکراف نے تو بعد میں

''نکل جاتی ہے جس کے مُنہ سے سچی بات مستی میں

فقیہہ مصلحت بیں سے وہ رند بادہ خوار اچھا!''

کے مصداق یہ ''اَن کہنی'' بھی کہہ ہی دی کہ ''ہم نے یہ جنگ اسرائیل کے تحفظ ہی کے لیے لڑی تھی!'') ـــــ تاہم جب حضرت مہدی کی قیادت میں اور مشرق سے آنے والی کمک کی مدد سے مسلمانانِ عرب کامیابیاں حاصل کرنی شروع کریں گے تو یہودی بھی جنگ میں کود پڑیں گے اور یہی مرحلہ ''**المسیحُ الدّجّال** '' کے خروج کا ہوگا ـــــ جس کے ہاتھوں مسلمانوں پر عذابِ الٰہی کے کچھ مزید اور شدید تر کوڑے پڑیں گے۔ تاہم اس کے بعد حضرت مسیح علیہ السلام نازل ہوں گے اور ان کے ہاتھوں نہ صرف یہ کہ دجال قتل ہو گا' بلکہ پوری قومِ بنی اسرائیل پر بھی اللہ کا وہ عذابِ استیصال نازل ہو جائے گا جس کے مستحق وہ اب سے دو ہزار برس قبل حضرت مسیحؑ کا انکار کر کے ہو چکے تھے۔ چنانچہ اگرچہ ابتداءً مسیح الدجال کے ہاتھوں ''عظیم تر اسرائیل'' وجود میں آ جائے گا' تاہم بالآخر وہی ''عظیم تر اسرائیل'' سابقہ معزول و مغضوب اُمت مسلمہ کا ''عظیم تر قبرستان'' بن جائے گا۔

جہاں تک دجالی فتنے' دجالِ اکبر اور مسیح الدجال کی شخصیت (یا شخصیتوں) کا تعلق ہے' واقعہ یہ ہے کہ ان کا ذکر احادیث نبویہؐ میں جن مختلف پیرایوں میں آیا ہے ان کے بعض پہلو کم از کم راقم الحروف کے علم و فہم کی حد تک تا حال عقدۂ لاینحل کی حیثیت رکھتے ہیں جن کے حل کے لیے کسی عظیم اور محقق محدث ہی کا انتظار کرنا ہوگا۔ البتہ اس مسئلے کے چند پہلو بالکل واضح بھی ہیں' بالخصوص ''ملاحم'' کے سلسلے میں جس مسیح دجال کے خروج کا

ذکر آتا ہے اس کا معاملہ اپنی جگہ بھی بالکل واضح ہے' اور دنیا کے موجودہ حالات جو رُخ اختیار کر چکے ہیں ان کے پیش نظر تو بالکل ایسے محسوس ہوتا ہے کہ اس کے ظہور وخروج کے لیے سٹیج بھی بالکل تیار ہو چکا ہے۔

دجالی فتنے کے بارے میں اب سے کوئی ساٹھ برس قبل سورۃ الکہف کے حوالے سے ایک نہایت مفصل اور عالمانہ تحریر ایک ایسے عالم و فاضل شخص کے قلم سے نکلی تھی جو معقول ومنقول اور شریعت وطریقت چاروں کے جامع بھی تھے اور ان میں سے ہر ایک میں نہایت بلند مقام اور اعلیٰ مرتبے کے حامل بھی' یعنی مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ ۔ راقم کو ان کے نقطۂ نظر سے کامل اتفاق ہے۔ چنانچہ راقم نے بھی ان مباحث کو نہایت شرح وبسط کے ساتھ اپنے سورۃ الکہف کے دروس میں بیان کیا ہے' جو بحمد اللہ آڈیو کیسٹس کی صورت میں محفوظ ہیں۔

ان مباحث کا لب لباب یہ ہے کہ دجالی فتنے سے مراد عہد حاضر کی مادہ پرستانہ تہذیب ہے جس کے پورے تانے بانے اور تمام تر رگ وپے میں یہ نقطۂ نظر سرایت کیے ہوئے ہے کہ اصل اہمیت کی حامل اور توجہ والتفات کے قابل یہ کائنات ہے نہ کہ خالق کائنات کی ذات' اور مادّہ اور اس کے خصائص وقوانین ہیں نہ کہ روح اور اس کی کیفیات' اور یہ حیاتِ دُنیوی اور اس کی فلاح و بہبود ہے نہ کہ حیاتِ اُخروی اور اس کی فوز ونجات۔ چنانچہ نقطۂ نظر کی اس تبدیلی کا نتیجہ ہے کہ خالق نے انسان کو علم کے حصول کے جو دو ذرائع عطا کیے تھے' یعنی (۱) حواسِ ظاہری اور ان سے حاصل شدہ معلومات سے استدلال اور استنباط کے لیے عقل کا استعمال' اور (۲) مافوق الطبیعی حقائق تک رسائی اور عملی ہدایت کے لیے وحیٔ آسمانی کی پیروی' ان میں سے انسان نے مؤخر الذکر سے بالکل صرفِ نظر کر لیا ہے اور ساری توجہ کو صرف مقدم الذکر پر مرکوز کر دیا ہے۔ چنانچہ سائنس اور ٹیکنالوجی میں تو بے پناہ ترقی ہوئی لیکن اخلاق اور انسانیت کا دیوالہ نکل گیا۔ اس اعتبار سے اگر تہذیب حاضر کو ''یک چشمی'' کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ اس لیے کہ اس

کی مادّی آنکھ تو چوپٹ کھلی ہوئی ہے جب کہ روحانی آنکھ بالکل بند ہو چکی ہے۔ بہرحال اس دجالی فتنے نے اگرچہ اس وقت پورے کرۂ ارضی اور تمام عالم انسانیت کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا ہے‘ لیکن زیادہ افسوس اور ملامت و ماتم کے قابل ہے اُمتِ مسلمہ اور اس کا بھی افضل اور برتر حصہ یعنی مسلمانانِ عرب‘ کہ وہ بھی قرآن حکیم ایسی کامل اور محفوظ کتابِ ہدایت کے حامل اور اس پر ایمان کے مدعی ہونے کے باوجود اس فتنے میں پوری شدت کے ساتھ‘ بلکہ دوسروں سے بھی کچھ زیادہ ہی مبتلا ہیں۔ چنانچہ کتاب الملاحم کی احادیث میں بھی ایک ایسے فتنے کا ذکر ہے جس سے ’’عرب کا کوئی گھر نہیں بچے گا‘‘ اور بظاہر احوال وہ یہی مادہ پرستی اور اس کے لازمی نتیجے یعنی عیاشی و فحاشی کا فتنہ ہے جو اِن کے معاشرے میں اس لیے زیادہ شدت اختیار کر گیا ہے کہ ان کے یہاں سیّال سونے کے باعث دولت کی شدید ریل پیل ہو گئی ہے۔

بہرحال‘ نبی اکرم ﷺ نے جس دجالی فتنے کے اثرات سے اپنے دین و ایمان کو بچانے کے لیے سورۃ الکہف اور خصوصاً اس کی ابتدائی اور آخری آیات کو اکسیر کی سی تأثیر کی حامل اور تیر بہدف قرار دیا ہے وہ یہی مادہ پرستی‘ دنیا پرستی‘ زر پرستی اور شہوات پرستی کا فتنہ ہے!

اور اب آیئے دجال یا دجالوں کی جانب‘ تو ایک بات تو بالکل واضح ہے کہ آنحضور ﷺ نے اپنے بعد نبوت کا دعویٰ کرنے والے تمام اشخاص کو ’’دجال‘‘ قرار دیا ہے‘ اور ایک حدیث میں ان کی تعداد بھی بیان فرما دی ہے‘ یعنی تیس۔ البتہ یہ فیصلہ کرنا کم از کم راقم کے لیے مشکل ہے کہ آیا وہ ’’دجالِ اکبر‘‘ جس کے فتنے سے آنحضور ﷺ سمیت جملہ انبیاء علیہم السلام نے خود بھی اللہ کی پناہ مانگی اور اپنی اُمتوں کو بھی خبردار کیا‘ جو خدائی کا دعویٰ کرے گا اور جملہ اہل ایمان کے لیے شدید امتحان بن جائے گا‘ اور وہ مسیح الدجال جس کا ذکر کتاب الملاحم میں آخری زمانے کی جنگوں کے سلسلے میں آتا ہے‘ ایک ہی شخصیت کے دو نام ہیں یا یہ دو جدا اشخاص ہوں گے۔ البتہ جہاں تک مؤخر الذکر کا

تعلق ہےاس کا معاملہ بالکل واضح اور بآسانی سمجھ میں آ جانے والا ہے۔

دراصل یہود کی روایات اور عہد نامۂ قدیم میں مذکور انبیاء کرام علیہم السلام کی پیشین گوئیوں میں ایک ایسے ''مسیحا'' کی خبر تواتر کے ساتھ وارد ہوئی تھی جو بنی اسرائیل کو ''ذلت'' اور ''مسکنت'' سے نجات دلا کر انہیں ارضِ مقدس کے علاوہ اس پورے علاقے پر از سرِ نو غلبہ اور تمکن عطا کر دے گا جہاں تاریخ کے کسی بھی دور میں انہیں حکومت یا بالادستی حاصل رہی ہے۔ چنانچہ مکابی سلطنت کے زوال کے بعد جب بنی اسرائیل پر پہلے یونانیوں اور پھر رومیوں کی محکومی مسلط ہوئی تو وہ اپنے ''مسیح موعود'' کا شدت سے انتظار کرنے لگے۔ لیکن جب وہ مسیح موعود عیسیٰ ابن مریم علیہما السلام کی صورت میں تشریف لے آئے تو یہود کی انتہائی بدبختی کہ انہوں نے بحیثیت مجموعی ان کا انکار کیا اور انہیں صرف ردّ ہی نہیں کیا' بلکہ کافر اور مرتد ٹھہرا کر واجب القتل قرار دے دیا اور اپنے بس پڑتے تو سولی پر چڑھوا کر ہی دم لیا۔ یہ دوسری بات ہے کہ اللہ نے آنجناب ؑ کو زندہ آسمان پر اٹھا لیا۔ بہرحال اس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہود کے یہاں ''مسیح'' کی جگہ تا حال خالی ہے اور وہ اپنے مسیحا کا اب بھی انتظار کر رہے ہیں۔

حضرت مسیح علیہ السلام کے رفع سماوی کے بعد سے اب تک یہودیوں پر جس ذلت و مسکنت اور نکبت و اِدبار کے سائے رہے' ان کے مختلف اَدوار کی تاریخ کسی گزشتہ صحبت میں بیان ہو چکی ہے۔ اس وقت جس حقیقت کی جانب توجہ دلانی مقصود ہے وہ یہ ہے کہ اب سے لگ بھگ ایک سو سال قبل (۱۸۹۷ء میں) بعض نہایت ذہین لیکن عیار اور سازشی مزاج کے یہودیوں نے اپنی عظمت گزشتہ اور سطوتِ پارینہ کی بازیافت کے لیے ایک منصوبہ تیار کیا جس پر عمل کے نتیجے میں انہیں پہلی کامیابی ۱۹۱۷ء میں ''اعلانِ بالفور'' کی صورت میں حاصل ہوئی، جس کے ذریعے ارضِ فلسطین پر ان کا ''حق'' بھی تسلیم کر لیا گیا۔ دوسری اور بڑی کامیابی ۱۹۴۸ء میں حاصل ہوئی جب فلسطین میں ان کی ایک آزاد ریاست قائم ہو گئی اور اسرائیل کا خنجر عالم عرب کے سینے میں پیوست ہو گیا۔ پھر

ایک اور کامیابی ۱۹۶۷ء میں حاصل ہوئی جب چھ روزہ جنگ کے نتیجے میں اسرائیل کی حدود میں وسعت اور رقبے میں اضافے پر مستزاد بیت المقدس یعنی یروشلم پر بھی ان کا قبضہ ہو گیا۔ حال ہی میں ایک اور کامیابی انہیں خلیج کی جنگ کے بعد حاصل ہوئی، اور وہ یہ کہ فلسطینیوں سمیت تمام عرب ممالک نے اسرائیل کو اِس حد تک تو تسلیم کر ہی لیا کہ اس کے ساتھ مذاکرات کی میز پر بیٹھنے کے لیے تیار ہو گئے۔ اب ظاہر ہے کہ ان کی آخری منزلِ مقصود ع ''دو چار ہاتھ جب کہ لب بام رہ گیا!'' کی مصداقِ کامل بن چکی ہے، اور وہ ہے عظیم تر اسرائیل کا قیام اور ہیکل سلیمانی کی تعمیر نو۔ اس آخری منزل تک پہنچنے کے لیے یہود کا سازشی ذہن ایسی تدابیر اختیار کرے گا کہ ''مسلم فنڈا منٹلزم'' کا ہوّا دکھا کر مغرب کی عیسائی دنیا کو مسلمانوں خصوصاً عربوں سے لڑوا دے۔ چنانچہ یہی سلسلۂ ''ملاحم'' کا اصل پس منظر ہو گا، اور اس کے ضمن میں جب اسرائیلی یہودی دیکھیں گے کہ حضرت مہدیؒ کی قیادت میں مسلمانوں کا پلڑا بھاری ہونے لگا ہے تو کوئی اسرائیلی لیڈر ''اَنَا المسیح'' کا نعرہ لگا کر میدان میں کود جائے گا، چنانچہ یہی ''**المسیحُ الدّجّال**'' ہو گا جس کے ہاتھوں مسلمانوں کو شدید ہزیمت اٹھانی پڑے گی اور ایک بار تو عظیم تر اسرائیل قائم ہو ہی جائے گا۔ یہ دوسری بات ہے کہ پھر اللہ تعالیٰ اصل حضرت مسیح علیہ السلام کو بھیج کر یہودیوں کا قلع قمع کر دے گا اور وہی عظیم تر اسرائیل ان کا عظیم تر قبرستان بن جائے گا۔ وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ!!

ان تمام امور میں ظاہر ہے کہ سوائے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کے کوئی ایک بات بھی نہ خلافِ قیاس ہے نہ عام عادی قوانین طبعی کے متضاد! البتہ عہد حاضر کے دجالی فتنے یعنی مادہ پرستانہ نقطۂ نظر کے غلبے کے باعث خود مسلمان، بالخصوص ان کے جدید تعلیم یافتہ طبقات اور ان میں سے بھی خاص طور پر وہ جو فتنۂ قادیانیت اور فتنۂ انکارِ حدیث سے متأثر ہیں، حضرت عیسیٰؑ کے رفع سماوی ہی کے قائل نہیں رہے تو نزول کو کیسے تسلیم کر سکتے ہیں! تاہم اس معاملے میں کسی ایسے شخص کو کوئی اشکال لاحق نہیں ہو سکتا جو ایمان رکھتا ہو کہ جملہ

قوانین طبیعیہ اللہ تعالیٰ ہی کے بنائے ہوئے ہیں اور ان کے باعث اس کے ہاتھ بندھ نہیں گئے ہیں‘ بلکہ ﴿یَدٰہُ مَبْسُوْطَتٰنِ﴾ (المائدۃ:٦٤) ’’اس کے دونوں ہاتھ کھلے ہوئے ہیں۔‘‘ کے مصداق وہ جب چاہے ان قوانین طبیعیہ کو معطل یا ساقط کر سکتا ہے۔ اسی طرح جملہ اشیاء میں تمام خواص وصفات اور کُل تأثیرات اس ہی کی ودیعت کردہ ہیں‘ وہ جب چاہے انہیں سلب کر سکتا ہے۔ مزید برآں وہ مادی اسباب و وسائل کا محتاج نہیں‘ بلکہ جملہ مادی اسباب و ذرائع اس کے ’’اِذن‘‘ کے منتظر رہتے ہیں! الغرض یہ معاملہ ایک قادرِ مطلق اور ’’فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ‘‘ خدا پر ایمان بالغیب اور اس کی قدرتِ کاملہ اور حکمت بالغہ پر یقین کامل کا ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کا حصہ وافر عطا فرمائے ——۔ آمین!

جیسے کہ گزشتہ صحبت میں عرض کیا جا چکا ہے‘ ان مباحث میں سے اکثر کی اہمیت صرف علمی اعتبار سے ہے۔ چنانچہ ان پر گفتگو یہیں ختم ہو رہی ہے۔ ہمارے لیے عملی اعتبار سے اصل اہمیت اس امر کی ہے کہ بحیثیت پاکستانی مسلمان ہم کس مقام پر کھڑے ہیں اور ارضِ مشرق کے مکین ہونے کے ناطے ہماری کیا خصوصی ذمہ داریاں ہیں۔ چنانچہ آئندہ اسی مسئلے پر گفتگو ہو گی۔

(۲۲ / جون ۱۹۹۳)

باب سیزدھم

ملتِ اسلامیہ پاکستان کی خصوصی ذمہ داری

اگرچہ بعض لوگوں کا خیال تو یہ ہے کہ اِس وقت دنیا میں مسلمانوں کی کُل تعداد پونے دوارب تک پہنچ چکی ہے، تاہم محتاط اندازوں کے مطابق بھی یہ تعداد سوا ارب کے لگ بھگ یعنی ایک سوبیس اور ایک سوتیس کروڑ کے مابین ضرور ہے۔

سورۃ الجمعۃ کی دوسری اور تیسری آیات کی رو سے تو یہ اُمت صرف دو حصوں میں منقسم ہے۔ یعنی ایک ''اُمّی'' عرب جن کو بقیہ تمام مسلمانوں پر مطلق فضیلت اوّلاً اس بنا پر حاصل تھی کہ خود نبی اکرم ﷺ بھی ان ہی میں سے تھے' اور ثانیاً اس بنا پر کہ ان ہی کی جانب آپ ؐ کی خصوصی بعثت تھی۔ چنانچہ ان ہی کی زبان میں اللہ کا آخری پیغام اور کامل ہدایت نامہ نازل ہوا۔ اور دوسرے ''آخرین'' یعنی بقیہ تمام نسلوں اور قوموں سے تعلق رکھنے والے مسلمان جو وقتاً فوقتاً اُمتِ محمدؐ میں شامل ہو کر اس کی عمومی فضیلت میں شریک ہوتے چلے گئے۔ لیکن موجودہ حالات میں یہ اُمت تین حصوں میں منقسم قرار دی جاسکتی ہے' یعنی:

(۱) مغربی ایشیا اور شمالی افریقہ کے ان ممالک کے لوگ جن کی مادری زبان عربی بن چکی ہے۔ یہ تعداد میں لگ بھگ بیس کروڑ' گویا کل اُمت کا چھٹا حصہ ہیں۔

(۲) سابق برعظیم ہند' اور موجودہ بھارت' پاکستان اور بنگلہ دیش کے وہ مسلمان جن کی مادری زبانیں اور بولیاں تو بے شمار ہیں لیکن سب کی ''لنگوا فرینکا'' کی حیثیت اردو کو حاصل ہے۔ یہ تعداد میں لگ بھگ چالیس کروڑ یعنی کل اُمت کا تیسرا حصہ ہیں۔

(۳) باقی پوری دنیا میں پھیلے ہوئے مسلمان جن کی مجموعی تعداد ساٹھ کروڑ کے

قریب ہے‘ اوراس طرح وہ پوری اُمت کی مجموعی تعداد کا نصف ہیں۔ان میں سے ایک تہائی کے لگ بھگ تو صرف انڈونیشیا اور ملائیشیا میں آباد ہیں‘ باقی دو تہائی میں ترکی‘ ایران اور افغانستان ایسے خالص اور قدیم مسلمان ممالک کے علاوہ مغربی اور وسطی افریقہ کے ممالک اور سابق روسی ترکستان اور چینی ترکستان میں آباد مسلمان شامل ہیں۔

ان ایک ارب کے قریب غیر عرب مسلمانوں میں ایک اضافی درجۂ فضیلت گزشتہ چارسوسال سے برعظیم پاک وہند میں آباد مسلمانوں کو حاصل رہا ہے‘ جس کی بنا پر ع ’’جن کے رتبے ہیں سوا‘ ان کی سوا مشکل ہے!‘‘ کے مصداق اللہ کے دین اور محمد ﷺ کی رسالت کے ضمن میں ایک خصوصی ذمہ داری کا بھاری بوجھ ان کے کندھوں پر تھا‘ جسے تاریخ کی ایک کروٹ نے پورے کا پورا مسلمانانِ پاکستان کے کندھوں پر ڈال دیا ہے‘ جس کا صحیح فہم وشعور ع ’’اپنی خودی پہچان‘ او غافل افغان!‘‘ کے مصداق ملتِ اسلامیہ پاکستان کے لیے نہایت ضروری ہے۔

سب جانتے ہیں کہ فضل یا فضیلت خالص وہبی شے ہے اور عالم انسانی میں فضیلت کی اصل اساس نبوت رہی ہے۔ چنانچہ سابقہ اُمت مسلمہ یعنی بنی اسرائیل کی اس عظیم فضیلت کی بنیاد‘ جس کا ذکر سورۃ البقرۃ کی دو آیات (۴۷ اور ۱۲۲) میں ان الفاظ میں وارد ہوا کہ: ﴿وَاَنِّیْ فَضَّلْتُکُمْ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ ○﴾ ’’میں نے تو تمہیں تمام جہان والوں پر فضیلت عطا فرما دی تھی‘‘ یہی تھی کہ ان میں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک پورے چودہ سو برس نبوت کا سلسلہ اس طور سے جاری رہا کہ کبھی یہ تار ٹوٹا ہی نہیں! حضرت عیسیٰؑ کے بعد مسلسل چھ سو سال ’’فترتِ اولیٰ‘‘ کا زمانہ ہے جس کے دوران نبوت کا سلسلہ منقطع رہا اور اس کے بعد نبوت ورسالت کا ماہِ کامل یا خورشید جہاں تاب محمد ﷺ کی صورت میں طلوع ہوا‘ جن کے سر مبارک پر ختم نبوت اور تکمیل رسالت کا تاج رکھا گیا۔ چنانچہ ایک جانب آپؐ خود ﴿اِنَّ فَضْلَهٗ كَانَ عَلَیْكَ كَبِیْرًا ﴿۸۷﴾﴾ (بنی

اسرائیل) یعنی ''یقیناً اللہ کا فضل آپؐ پر تو نہایت ہی عظیم و کبیر ہے!'' کے مصداقِ کامل قرار پائے تو دوسری جانب آپؐ کی اُمت میں شامل ہونے والے بھی' خواہ وہ ''اُمّی'' عربوں میں سے تھے' خواہ ''آخرین'' میں سے' آپؐ کے اس فضل عظیم کے وارث قرار پائے' بقوائے: ﴿ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ط وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۝۴﴾ (الجمعۃ) یعنی ''یہ اللہ کا فضل ہے، وہ دیتا ہے جس کو چاہتا ہے' اور اللہ بہت بڑے فضل والا ہے!'' اس لیے کہ اگر چہ آپؐ پر نبوت کا سلسلہ ختم اور منقطع ہو گیا تاہم حسب ذیل آیات کی رو سے آپؐ کی رسالت کے فرائض کی عالمی سطح پر اور تا قیامِ قیامت ادائیگی مجموعی طور پر آپؐ کی اُمت ہی کے حوالے کی گئی:

(۱) ﴿كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ا﴾ (آل عمران : ۱۱۰)

''تم بہترین اُمت ہو جسے جملہ انسانوں کے لیے برپا کیا گیا ہے۔ تمہارا کام ہی یہ ہے کہ نیکی کا حکم دو' برائیوں سے روکو اور خود اللہ پر پختہ ایمان رکھو!''

(۲) ﴿وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ط هُوَ اجْتَبٰكُمْ...... لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ج﴾ (الحج : ۷۸)

''اللہ کی راہ میں جہاد کرو' جتنا اور جیسا کہ اس کے لیے جہاد کا حق ہے۔ اللہ نے تمہیں منتخب فرما لیا ہے...... تاکہ رسول (ﷺ) تم پر حجت قائم کریں اور تم پوری نوعِ انسانی پر حجت قائم کرو!''

(۳) ﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ط﴾ (البقرۃ:۱۴۳)

''اور اس نے تمہیں ایک اُمت وسط بنایا ہی اس لیے ہے کہ تم تمام لوگوں پر حجت قائم کرو اور ہمارے رسول (ﷺ) تم پر حجت قائم کریں''۔

اِس فریضۂ رسالتِ محمدیؐ کی ادائیگی اور شہادت علی الناس کی ذمہ داری اگرچہ اُمت محمد ﷺ پر بحیثیت مجموعی ڈالی گئی ہے' تاہم ع ''جن کے رُتبے ہیں سوا' ان کی سوا مشکل

ہے!''اور ؎

نہ ہر زن زن است و نہ ہر مرد مرد
خدا پنج انگشت یکساں نہ کرد!

کے مصداق' اور اللہ تعالیٰ کے اس ابدی قانون کے مطابق کہ ''اللہ ہر ایک پر ذمہ داری کا بوجھ اس کی وسعت کے مطابق ہی ڈالتا ہے!'' جو قرآن حکیم میں متعدد بار بیان ہوا ہے(۱) اس عظیم ذمہ داری کا سب سے زیادہ بوجھ ان لوگوں پر ہے جن کی مادری زبان عربی ہے' لہٰذا انہیں قرآن حکیم کو سمجھنے کے لیے کسی اضافی محنت اور مشقت کی ضرورت نہیں ہے! اور ظاہر ہے کہ قرآن حکیم ہی نبوت کے اس سلسلے کا اصل قائم مقام ہے جو نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ مبارک پر ختم اور منقطع ہو چکا ہے۔

تاہم ختم نبوت سے جو خلا پیدا ہوا اُس کو پُر کرنے کی ایک اضافی تدبیر اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمتِ کاملہ کے تحت یہ اختیار فرمائی کہ ایک جانب مجدّدین کا سلسلہ جاری فرمایا جو وقتاً فوقتاً دین کی اصل تعلیمات اور اللہ کی اصل ہدایت کو ازسرنو نکھار کر پیش کرتے رہے۔ اور دوسری جانب یہ ضمانت دے دی کہ ''اس اُمت میں ہمیشہ کم از کم ایک گروہ یا جماعت ضرور حق پر قائم رہے گی۔'' (بخاریؒ و مسلمؒ عن معاویہؓ) اور یہ دونوں امر اس اعتبار سے باہم لازم و ملزوم ہیں کہ بالکل فطری اور منطقی طور پر ہر مجدد کی تعلیمات اور مساعی کے نتیجے میں لامحالہ ایک حلقہ یا گروہ ایسا وجود میں آتا رہا جو دینِ حق کی اصل تعلیمات کا علمبردار اور اپنے وجود کے اعتبار سے کم از کم ذاتی زندگی اور انفرادی سیرت و کردار کی حد تک اسلام کی حقیقی تعلیمات کا نمونہ اور آئینہ دار بن گیا۔ اگرچہ دنیا کے اس طبعی قانون کے مطابق کہ ہر جوانی پر لازماً بڑھاپا بھی آ کر رہتا ہے اور ہر کمال کو بالآخر زوال سے دوچار ہونا ہی پڑتا ہے' یہ حلقہ یا گروہ یا جماعت دوسری یا تیسری یا زیادہ سے زیادہ چوتھی نسل تک پہنچ کر لازماً ایک تقلیدی اور موروثی ''فرقہ'' بن جاتا رہا' اور اس

(۱) جیسے مثلاً سورۃ البقرۃ: ۲۳۳ اور ۲۸۶' سورۃ الانعام: ۱۵۲' سورۃ الاعراف: ۴۲ اور سورۃ المؤمنون: ۶۲۔

طرح ایک نئے مجدد کی ضرورت پیش آتی رہی جس کے زیر اثر ایک نئی جمعیت یا جماعت وجود میں آئے۔ یہی وجہ ہے کہ حدیثِ نبویؐ میں مجددین کے ضمن میں سوسو سال کے وقفے کا ذکر ہے' یعنی: ''اللہ تعالیٰ اس اُمت میں ہر سوسال کے سرے پر ایسے لوگوں کو اٹھاتا رہے گا جو دین کی تجدید کرتے رہیں گے (یعنی اسے تازہ کرتے رہیں گے۔)''

بہرحال ان مجددین اُمت اور ان کے تلامذہ اور متبعین کی مساعی کے نتیجے میں دین حق کی تعلیمات گزشتہ چودہ سوسال کے دوران اسی طرح منتقل ہوتی چلی آئیں جس طرح اولمپک ٹارچ (مشعل) ایک کھلاڑی سے دوسرے کھلاڑی کو منتقل ہوتی رہتی ہے' یا شیر شاہ سوری کے زمانے میں ڈھاکہ سے پشاور تک ڈاک کے تھیلے ہر تیس میل کے بعد ایک گھڑ سوار سے دوسرے کو منتقل ہوتے رہتے تھے!

اور اب اس پس منظر میں مشاہدہ فرمایئے اس عظیم حقیقت کا کہ پورے ایک ہزار برس تک مجددین کا یہ سلسلہ عالم عرب ہی میں جاری رہا۔ چنانچہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ اور حضرت حسن بصریؒ سے امام غزالیؒ اور شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہؒ تک پورے سات سو برس کے عرصے میں تمام مشاہیر علماء' ائمہ ہدایت اور مجددین اُمت عالم عرب ہی میں پیدا ہوتے رہے۔ لیکن فتنۂ تاتار کے دوران جب کہ وسطی اور مغربی ایشیا شورش و ہلاکت اور تباہی و بربادی کا شکار ہوئے' اسلام کی علمی اور روحانی وراثت تدریجاً سرزمین ہند کو منتقل ہوتی چلی گئی' تاآنکہ جیسے ہی اُمت کی تاریخ کے ''الف ثانی'' یعنی دوسرے ہزار سالہ دور کا آغاز ہوا تجدید دین کا اصل مرکز ہندوستان بن گیا۔ چنانچہ گیارہویں صدی ہجری کے عظیم ترین مجدد شیخ احمد سرہندیؒ بھی یہیں پیدا ہوئے جن کے مرقد کے بارے میں علامہ اقبال نے فرمایا ہے کہ ع ''وہ خاک کہ ہے زیر فلک مطلع انوار' اور جن کی ذات کے بارے میں فرمایا ہے کہ ع ''جس کے نفس گرم سے ہے گرمیٔ احرار!'' پھر بارہویں صدی ہجری کے مجدد اعظم شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ بھی یہیں پیدا ہوئے' جو تنہا اپنی ذات میں جملہ علومِ اسلامی ہی کے مجدد نہیں فکر اسلامی اور حکمت دینی کے بھی مجددِ اعظم تھے۔ پھر تیرہویں صدی ہجری میں سید احمد

بریلویؒ بھی یہیں پیدا ہوئے جو بلا شبہ سلوکِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام اور جہادِ اسلامی کے مجددِ اعظم تھے اور ان کا اور ان کے ساتھی شہداء کا خون سرزمین بالاکوٹ میں جذب ہوا۔

بنا کردند خوش رسمے بہ خاک و خون غلطیدند
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را!

اسی طرح چودہویں صدی ہجری میں بھی جو اعاظم رجال سرزمین ہند میں پیدا ہوئے ان کی نظیر پورا عالم اسلام پیش کرنے سے قاصر ہے۔ چنانچہ طبقۂ علماء میں سے اسیر مالٹا شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ ایسی عظیم شخصیت' اور جدید تعلیم یافتہ لوگوں میں سے علامہ اقبال ایسا مفکر ملت اور حکیم اُمت' پھر مولانا محمد الیاس ایسا عظیم مبلغ اور مولانا مودودی ایسا عظیم مصنف پورے عالم اسلام میں کہیں ڈھونڈنے سے بھی نہیں مل سکتا! ﴿ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۝۴﴾ (الجمعۃ) ''یہ اللہ کا فضل ہے' وہ جسے چاہتا ہے دیتا ہے' اور اللہ بڑے فضل والا ہے''۔

الغرض' گزشتہ پوری چار صدیوں کے دوران اگر دین کے علم وفکر ہی نہیں' دعوت و جہاد کی تجدید کا مرکز بھی ہندوستان بنا رہا تو ظاہر ہے کہ یہ مشیت ایزدی کے تحت ہی ہوا اور جس طرح علامہ اقبال نے کوہ ہمالیہ سے مخاطب ہو کر فرمایا تھا کہ ؏ ''برف نے باندھی ہے دستارِ فضیلت تیرے سر!'' اسی طرح واقعہ یہ ہے کہ ''الف ثانی'' کی ان تجدیدی مساعی نے ملت اسلامیہ ہندیہ کے سر پر ایک عظیم دستارِ فضیلت باندھ دی ہے جس کی بنا پر اس کی ذمہ داری بھی بقیہ پوری اُمت مسلمہ کے مقابلے میں نہایت عظیم' گراں اور دہ چند ہی نہیں سوگنا بن گئی ہے!

اور اب توجہ فرمایئے تاریخ کی اس ''کروٹ'' کی جانب جس کے نتیجے میں اس عظیم ذمہ داری کا پورا بوجھ ملت اسلامیہ پاکستان کے کندھوں پر آ گیا ہے۔ یہ کروٹ تحریک پاکستان اور اس کے نتیجے میں قیامِ پاکستان سے عبارت ہے' جس کا اعلانیہ مقصد اسلام

کے نظامِ عدلِ اجتماعی کا قیام اور پورے عالمِ انسانیت کے سامنے اسلام کے ''اصولِ حریت واخوت ومساوات کا ایک نمونہ'' پیش کرنا تھا۔ چنانچہ مفکر ومصورِ پاکستان علامہ محمد اقبال نے بھی اپنے خطبہ الٰہ آباد (۱۹۳۰ء) میں فرمایا تھا کہ: ''مجھے یقین ہے کہ ہندوستان کے شمال مغربی علاقے میں ایک آزاد مسلمان ریاست کا قیام تقدیرِ مبرم ہے۔ اور اگر ایسا ہوگیا تو ہمیں ایک موقع مل جائے گا کہ اسلام کی اصل تعلیمات پر جو پردے عرب ملوکیت (امپیریلزم) کے دَور میں پڑ گئے تھے انہیں ہٹا کر دوبارہ اصل اسلام کا ایک نمونہ دنیا کے سامنے پیش کرسکیں!'' اور بانی ومعمارِ پاکستان محمد علی جناح نے بھی بارہا ان ہی خیالات کا اظہار فرمایا تھا۔ اور قیامِ پاکستان کی صورت میں غالب اور جارح ہندو اکثریت کے ملک بھارت میں شامل رہ جانے والے علاقوں کے مسلمانوں نے بھی ؎

''جو ہم پہ گزری سو گزری مگر شب ہجراں
ہمارے اشک تری عاقبت سنوار چلے!''

کے مصداق اس سے بالکل بے پروا ہو کر کہ تقسیم ہند کے بعد اُن پر کیا بیتے گی' تحریکِ پاکستان میں بھرپور حصہ ہی نہیں اصل فیصلہ کن کردار ادا کر کے گویا مذکورہ بالا چار صد سالہ تجدیدی مساعی کی وراثت کے ناطے جو عظیم ذمہ داری جملہ مسلمانانِ ہند پر عائد ہوتی تھی اس میں سے اپنے حصے کا ''فرضِ کفایہ'' ادا کر دیا' جس کی قیمت وہ تاحال مسلسل اپنے جانی ضیاع اور مالی نقصان کی صورت میں ادا کر رہے ہیں۔ بنابریں اب اس عظیم ذمہ داری کا پورا بوجھ ملتِ اسلامیہ پاکستان کے کندھوں پر ہے' اور اس کی قسمت یا بدقسمتی بالکلیہ اسی کے ساتھ وابستہ ہے!

اور یہ بلاشبہ ہر باشعور پاکستانی مسلمان کے لیے اہم ''لمحۂ فکریہ'' ہے کہ (۱) اگر وہی بنی اسرائیل جو ''ہم نے تو تمہیں تمام جہان والوں پر فضیلت عطا کر دی تھی!'' کے مصداقِ کامل تھے' اللہ کے ساتھ کیے جانے والے قول وقرار اور عہد ومیثاق سے انحراف اور اللہ کے دین اور شریعت کی غلط نمائندگی کے باعث ''ان پر ذلت اور مسکنت مسلط

کر دی گئی اور وہ اللہ کے غضب میں گھر گئے!'' کی تصویر بن گئے' اور (۲) مسلمانانِ عرب بھی اپنی تمام تر فضیلتوں کے باوجود ان ہی جرائم کی پاداش میں اللہ کے بے لاگ عدل کے باعث معزول و معتوب ہوئے' چنانچہ اوّلاً اب سے ساڑھے سات سو سال قبل یعنی ۱۲۵۸ء میں سقوطِ بغداد اور خلافتِ بنوعباس کے خاتمے پر قرآن مجید میں وارد شدہ پیشگی تنبیہہ ﴿اِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ﴾ (محمد: ۳۸) ''اگر تم پیٹھ پھیر لو گے تو اللہ تمہیں ہٹا کر کسی اور قوم کو لے آئے گا!'' کے مطابق اُمت مسلمہ کی قیادت و سیادت سے معزول کر دیے گئے تھے اور اب بھی ایک مغضوب اور ملعون قوم کے ہاتھوں مسلسل پٹ رہے ہیں' جس کی شدت نبی اکرم ﷺ کی ان پیشین گوئیوں کے مطابق جن پر مفصل گفتگو اس سے قبل ہو چکی ہے' مستقبل قریب میں اپنے نقطۂ عروج کو پہنچ جانے والی ہے!۔ تو ﴿فَكَيْفَ تَتَّقُوْنَ اِنْ كَفَرْتُمْ﴾ (المزمل: ۱۷) ''پھر تم کیونکر بچو گے اگر تم نے انکار کیا؟'' کے مصداق ہم اللہ کے قانونِ عذاب اور اصولِ مکافاتِ عمل سے کیسے بچ سکیں گے!

چنانچہ ان سطور کے راقم کو پوری شدت کے ساتھ یہ احساس لاحق ہے کہ ہم بحیثیت ملتِ اسلامیہ پاکستان اللہ کے قانونِ عذاب کی گرفت میں آ چکے ہیں' اور اس عظیم قانون کی اس دفعہ کے مطابق جو سورۃ السجدۃ کی آیت ۲۱ میں وارد ہوئی ہے' یعنی: ''ہم انہیں بڑے عذاب سے قبل چھوٹے عذاب کا مزہ ضرور چکھائیں گے' شاید کہ یہ لوٹ آئیں!'' ہماری پیٹھ پر عذابِ الٰہی کا ایک شدید کوڑا ۱۹۷۱ء میں سقوطِ ڈھاکہ اور مشرقی پاکستان کی بنگلہ دیش کی صورت میں قلبِ ماہیت' اور سب سے بڑھ کر ایک ذلت آمیز اور عبرتناک شکست کی صورت میں پڑ چکا ہے' جس کے نتیجے میں ترانوے ہزار پاکستانی اُن ہندوؤں کے قیدی بنے تھے جن پر مسلمانوں نے کہیں ہزار برس' کہیں آٹھ سو برس اور کہیں چھ سو برس حکومت کی تھی! —— اور چونکہ ہم نے اس کے بعد سے آج تک اللہ اور اس کے دین کی جانب ''رجوع'' کا کوئی ثبوت نہیں دیا' لہٰذا اب ''بڑے

عذاب'' کا کوڑا بھی ہمارے سروں پر اسی طرح تانا جا چکا ہے جس طرح کبھی حضرت یونس علیہ السلام کی قوم پر عذابِ استیصال کے آثار شروع ہو گئے تھے! (اگرچہ وہ عذاب قوم کی اجتماعی توبہ کے باعث ٹل گیا تھا۔ چنانچہ میں نے قومِ یونسؑ کی مثال اسی خیال سے دی ہے کہ شاید اللہ ملتِ اسلامیہ پاکستان کو بھی اس ہی کے مانند اجتماعی توبہ کی توفیق عطا فرما دے۔ آمین یا ربّ العالمین!) اور میری تشویش کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں پہلے عذاب سے قبل بھی پچیس برس کی مہلت دی تھی (سقوطِ ڈھاکہ کے وقت قیام پاکستان پر قمری حساب سے پچیس برس بیت چکے تھے!) اور اب پھر قمری حساب سے دوسرے پچیس برس کی مہلت کے ختم ہونے میں کل پونے تین سال باقی رہ گئے ہیں! الغرض، معاملہ وہی ہے کہ ع :

حذر اے چیرہ دستاں، سخت ہیں فطرت کی تعزیریں!

اور: ؎

فطرت افراد سے اِغماض بھی کر لیتی ہے
نہیں کرتی کبھی ملت کے گناہوں کو معاف!

اور: ؎

اٹھو وگرنہ حشر نہیں ہو گا پھر کبھی
دوڑو، زمانہ چال قیامت کی چل گیا!

(۲۹/جون ۱۹۹۳ء)

باب چهار دهم

پاکستان کا مستقبل

اگرچہ نبی اکرم ﷺ کا فرمانِ مبارک تو یہ ہے کہ ''موت کا ذکر کثرت کے ساتھ کیا کرو' جو تمام لذتوں کا خاتمہ کر دینے والی ہے۔'' (ترمذیؒ' نسائیؒ اور ابن ماجہؒ۔ عن ابی ہریرہؓ) اسی طرح آپ ﷺ کا فرمانِ مبارک یہ بھی ہے کہ موت کا تذکرہ اور قرآن کی تلاوت کثرت کے ساتھ کیا کرو۔ چنانچہ ایک بار آپؐ نے فرمایا کہ ''انسانوں کے دلوں پر بھی زنگ لگ جایا کرتا ہے جیسے کہ لوہے پر زنگ لگ جاتا ہے اگر اس پر پانی پڑتا رہے!'' اس پر جب آپؐ سے سوال کیا گیا کہ: ''حضورؐ! یہ فرمائیے کہ پھر ان کو از سر نو جلا کیسے دی جائے؟'' تو آپؐ نے ارشاد فرمایا: ''دو کام کثرت کے ساتھ کیا کرو: ایک موت کا ذکر اور دوسرے تلاوتِ قرآن!'' (سنن بیہقیؒ) لیکن آج کل کے ''مترفین'' یعنی مرفّہ الحال لوگ اور اصحابِ دولت و ثروت موت کے ذکر کو ناپسند کرتے ہیں۔ چنانچہ کچھ عرصہ ہوا کہ ایک دوست نے جو پی آئی اے میں کام کرتے ہیں' یہ بتایا تھا کہ جب سعودی ائیر لائنز کے دیکھا دیکھی پی آئی اے کی پروازوں کے آغاز میں بھی سفر کی اس دعا کا اہتمام کیا جانے لگا جو قرآن حکیم میں وارد ہوئی ہے' تو بہت سے لوگوں نے باضابطہ احتجاج کیا اور زور دیا کہ اس دعا کا صرف پہلا حصہ پڑھا جائے' یعنی: ﴿سُبۡحٰنَ الَّذِیۡ سَخَّرَ لَنَا ہٰذَا وَ مَا کُنَّا لَہٗ مُقۡرِنِیۡنَ ﴿۱۳﴾﴾ (الزخرف) ''پاک ہے وہ ہستی جس نے ہمارے لیے اس (سواری) کو مسخر فرما دیا' ورنہ ہم تو ہرگز اس لائق نہ تھے کہ اس پر قابو پا سکتے!'' لیکن دوسرا حصہ نہ پڑھا جائے جس میں موت کا تذکرہ ہے' یعنی: ﴿وَ اِنَّاۤ اِلٰی رَبِّنَا لَمُنۡقَلِبُوۡنَ ﴿۱۴﴾﴾ (الزخرف) ''اور ہم سب بالآخر اپنے ربّ ہی کی جانب لوٹ

جانے والے ہیں!'' اس لیے کہ بقول ان کے اس طرح تو پی آئی اے گویا پرواز کے آغاز ہی میں تمام مسافروں کو موت کی جھلک دکھا دیتی ہے‘ جس سے قلوب اور اعصاب پر ''منفی'' اثر پڑتا ہے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیۡہِ رَاجِعُوۡنَ!

میں نے ابھی تک تو اس روایت کو بس ایک لطیفے ہی کے درجہ میں سمجھا تھا‘ لیکن حال ہی میں جب ایک اچھے بھلے معروف دانشور کی یہ بات سامنے آئی کہ قیامت کا ذکر منفی سوچ کا مظہر ہے تو ع ''ہمیں یقین ہوا‘ ہم کو اعتبار آیا!'' کے مصداق پہلی بات کا بھی ''حق الیقین'' حاصل ہو گیا۔ اگرچہ یہ کہنا مشکل ہے کہ اس پر صدمہ کی کیفیت زیادہ ہوئی یا حیرت اور تعجب کی کہ ایک مسلمان یہ بات کیسے کہہ سکتا ہے جب کہ قرآن مجید کا تو شاید کوئی ایک صفحہ بھی ایسا نہ ہو جس میں قیامت کا ذکر پورے شدّ ومدّ کے ساتھ نہ آیا ہو۔ بالآخر دل کو تسلی دی تو اس خیال کے ذریعے کہ شاید موصوف کی کسی لمبی تحریر کی تلخیص کسی صاحب نے کی ہو اور اس کی بنا پر یہ مغالطہ پیدا ہو گیا ہو۔ واللہ اعلم!

بہرحال‘ راقم الحروف اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اسے اس امر کا تو یقینِ کامل حاصل ہے ہی کہ قیامت آ کر رہے گی‘ جس کے نتیجے میں موجودہ عالم دنیا کا نظام درہم برہم ہو جائے گا‘ بلکہ الحمدللہ ثم الحمدللہ کہ اس کا بھی ''حق الیقین'' حاصل ہے کہ اس کے کچھ عرصے کے بعد (جس کی مدت کا علم صرف اللہ کو ہے!) ایک نئے عالم یعنی عالمِ آخرت کی بساط بچھائی جائے گی‘ چنانچہ تمام انسانوں کو دوبارہ پیدا کیا جائے گا اور پھر حشر ونشر اور حساب کتاب کا معاملہ ہو گا‘ اور بالآخر جزا وسزا یعنی جنت یا دوزخ کے فیصلے صادر ہوں گے! جیسے کہ نبی اکرم ﷺ نے اپنے اس نہایت ابتدائی دور کے خطبے میں وضاحت کے ساتھ ارشاد فرمایا تھا جو آپؐ نے اپنے پورے خاندان یعنی بنو ہاشم کے مجمع میں دعوتِ طعام کے بعد‘ اللہ تعالیٰ کے اس حکم پر عمل کرتے ہوئے دیا تھا کہ: ﴿وَاَنۡذِرۡ عَشِیۡرَتَکَ الۡاَقۡرَبِیۡنَ ﴿۲۱۴﴾﴾ (الشُّعراء) ''اور اپنے قریبی رشتہ داروں کو خبردار کرو!'' چنانچہ آپؐ کے الفاظِ مبارک یہ تھے:

ترجمہ: ''خدا کی قسم! تم سب پر موت وارد ہو کر رہے گی جیسے کہ تم روزانہ رات کو سو جاتے ہو' پھر تم سب کو لازماً دوبارہ اٹھا لیا جائے گا جیسے کہ تم روزانہ صبح کو بیدار ہو جاتے ہو' پھر یقیناً تم سب سے حساب لیا جائے گا اس کا جو تم کر رہے ہو' اور پھر تمہیں لازماً بدلہ مل کر رہے گا' بھلائی کا بھلا اور برائی کا برا' اور وہ یا تو جنت ہو گی ہمیشہ کے لیے یا پھر دوزخ کی آگ ہو گی ہمیشہ کے لیے!'' (ماخوذ از ''نہج البلاغہ'')

البتہ اس قیامِ قیامت اور بعث بعد الموت کے ساتھ ساتھ مجھے اس کا بھی یقین حاصل ہے کہ قیامت سے قبل پورے کرۂ ارضی پر اللہ کے دین حق کا غلبہ اور خلافت علیٰ منہاج النبوّت کے نظام کا قیام لازماً واقع ہو کر رہے گا۔ چنانچہ اس کے مفصل دلائل بھی میں قرآن حکیم کی آیات سے ''دلالت'' کی بنیاد پر' اور احادیثِ نبویہؐ سے ''صراحت'' کی اساس پر دے چکا ہوں۔ اور ع ''سرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ و نجف'' کے مصداق قرآن و حدیث ہی بندۂ مؤمن کی دو آنکھیں ہیں!

متذکرہ بالا دو امور کے بارے میں تو بحمد اللہ مجھے ''حق الیقین'' کی کیفیت حاصل ہے' البتہ اپنی ایک تیسری رائے کے ضمن میں مَیں صرف گمانِ غالب اور امید واثق کے الفاظ استعمال کر سکتا ہوں۔ (اگرچہ اس کی سرحدیں بھی ''یقین'' کے بالکل ساتھ جا ملتی ہیں!) اور وہ یہ کہ غلبۂ دینِ حق اور قیامِ نظامِ خلافت کا نقطۂ آغاز بننے کی سعادت اِن شاء اللہ العزیز' اسی ارضِ پاکستان اور اس سے ملحق سرزمین افغانستان کو حاصل ہو گی جسے ماضی میں ''خراسان'' کہا جاتا تھا! میرے اس ''یقین کی حد کو پہنچنے والے گمان'' کی بنیاد جہاں بعض احادیثِ نبویہؐ بھی ہیں جن کی بنا پر علامہ اقبال نے کہا تھا کہ

میرِ عربؐ کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے
میرا وطن وہی ہے' میرا وطن وہی ہے!

(مثلاً سنن ابن ماجہؒ کی حضرت عبداللہ بن حارث رضی اللہ عنہ سے روایت ہے جس کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مشرق کی جانب سے ایسے لوگ برآمد ہوں گے جو علاقوں پر علاقے فتح کرتے ہوئے مہدی کی مدد یعنی ان کی حکومت کو مستحکم کرنے کے لیے پہنچیں

گے‘‘ ۔ اور جامع ترمذیؒ کی حضرت ابوہریرہ ؓ سے روایت ہے جس کے مطابق آنحضورﷺ نے فرمایا: ’’خراسان کے علاقے سے سیاہ جھنڈے برآمد ہوں گے اور انہیں کوئی طاقت واپس نہیں پھیر سکے گی‘ یہاں تک کہ وہ ایلیا یعنی بیت المقدس میں نصب کر دیے جائیں گے‘‘ ۔اوکما قالﷺ!) وہاں اس کی اصل اور محکم اساس گزشتہ چار سو سال کی تاریخ پر قائم ہے‘ جو گواہی دیتی ہے کہ پچھلی چار صدیوں کے دوران میں تجدید دین کا سارا کام برعظیم پاک و ہند میں ہوا اور اس عرصے میں تمام مجددین اعظم اسی خطے میں پیدا ہوئے ـــــ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ مشیتِ ایزدی اور حکمتِ خداوندی میں کوئی طویل المیعاد منصوبہ اس خطۂ ارضی کے ساتھ وابستہ ہے۔

پھر سب جانتے ہیں کہ سرزمین افغانستان کا ہمیشہ سے برعظیم پاک و ہند کے ساتھ یہ ’’دوطرفہ تعلق‘‘ قائم رہا ہے کہ تمام فاتحین تو افغانستان سے ہندوستان کی جانب آتے رہے‘ لیکن صرف ایک استثناء یعنی اسلام کی اوّلین آمد کے علاوہ تہذیب وتمدن اور علم و حکمت کا سفر ہمیشہ ہندوستان سے افغانستان کی جانب رہا۔ چنانچہ ماضی میں بدھ مت بھی ہندوستان سے افغانستان گیا تھا‘ اور گزشتہ چار صدیوں کے دوران میں اسلام کی جملہ تجدیدی مساعی کے اثرات کے اعتبار سے بھی افغانستان برعظیم پاک و ہند کے ’’تابع‘‘ رہا۔ جس کی نہایت نمایاں مثال یہ ہے کہ اگرچہ مسلم فاتحین کے ساتھ تو سلسلۂ چشتیہ افغانستان سے ہندوستان آیا تھا لیکن پھر الف ثانی کے تجدیدی کارنامے کے اثرات کی صورت میں اوّلاً سلسلۂ مجددیہ پہلے افغانستان اور پھر پورے ترکستان تک پہنچا اور پھر شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور ان کے مدرسۂ فکر کا اثر و نفوذ بھی وسعت اور سرعت کے ساتھ ارضِ خراسان تک ممتد ہو گیا۔ اور اِس وقت ہر دیکھنے والی آنکھ دیکھ سکتی ہے (بشرطیکہ اس میں قرآن اور حدیث کا ’’سرمہ‘‘ لگا ہوا ہو!) کہ ’’وقت کے بہتے دریا‘‘ نے ایک جانب برعظیم پاک و ہند کی پوری چار صدیوں کی تجدیدی مساعی کی وراثت ارضِ پاکستان میں جمع کر دی ہے‘ اور دوسری جانب ارضِ خراسان میں اللہ تعالیٰ نے سپر پاورز

کی باہمی کشاکش کے ذریعے نہ صرف یہ کہ سوئی ہوئی مارشل اسپرٹ کو بیدار کر دیا ہے اور قدیم جذبۂ حریت کو مزید مہمیز دے دی ہے' بلکہ جذبۂ جہاد فی سبیل اللہ کو بھی قابل لحاظ حد تک قوی بنا دیا ہے' تو پھر کون سے تعجب کی بات ہوگی اگر تاریخ کی کوئی کروٹ ؎

''عطا مؤمن کو پھر درگاہِ حق سے ہونے والا ہے
شکوہِ ترکمانی' ذہن ہندی' نطق اعرابی!''

کے مصداق ایک جانب سے مجدد دین ہند کا علم وحکمت اور فکر وفہم اور دوسری جانب سے مسلمانانِ افغانستان کا جذبۂ عمل اور جوشِ جہاد دریائے سندھ اور دریائے کابل کے مانند باہم مل کر احیاءِ اسلام' غلبۂ دین اور عالمی نظامِ خلافت کے قیام کا نقطۂ آغاز بن جائیں۔ وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ!

میری ان باتوں پر بھی کوئی ''دانشور'' اگر چاہے تو بڑی آسانی کے ساتھ کسی افیمی کے خواب یا مجذوب کی بڑ کی پھبتی چست کر سکتا ہے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ کبھی کبھی خود میں بھی اس کیفیت سے دوچار ہو جاتا ہوں کہ ؎

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں
محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی!

تاہم مجھے یہ اطمینان ہے کہ میری ان باتوں کو کم از کم ''منفی سوچ'' کی مظہر قرار نہیں دیا جا سکتا۔

البتہ اس تیسری بات کے سلسلے میں دو سوالات کے جواب کے بارے میں مَیں نہایت متردّد بھی ہوں اور ان میں سے ایک کے بارے میں میرا ایک اندیشہ بھی قوی سے قوی تر ہوتا چلا جا رہا ہے' جسے قنوطیت اور یاس پسندی سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے اور منفی سوچ کا مظہر بھی قرار دیا جا سکتا ہے' لیکن ﴿مَآ اُرِيْكُمْ اِلَّا مَآ اَرٰى﴾ (المؤمن:۲۹) ''میں تمہیں وہی کچھ دکھا رہا ہوں جو خود دیکھ رہا ہوں!'' کے مصداق میں اپنے حقیقی احساسات بیان کرنے پر مجبور ہوں۔

ان دو سوالوں میں سے پہلا سوال تو یہ ہے کہ ﴿مَتٰى هُوَ؟﴾ (بنی اسرائیل:۵۱)

کے مصداق غلبۂ اسلام کا یہ مرحلہ کب شروع ہوگا؟ اور دوسرا یہ کہ اگر اس کا آغاز پاکستان ہی سے ہونا ہے تو ع ''کب کھلا تجھ پر یہ راز' انکار سے پہلے کہ بعد؟'' کے مصداق آیا پاکستان میں دینِ حق کا غلبہ اور نظامِ خلافت علیٰ منہاج النبوت کا قیام کسی سقوطِ مشرقی پاکستان جیسے' یا اس سے بھی عظیم تر سانحے اور حادثے کے بعد ہوگا؟ یا اس سے قبل کسی خارجی افتاد کے بغیر ہی ''رضا کارانہ توبہ'' کے ذریعے ہو جائے گا؟

جہاں تک ''مَتٰى هُوَ ''یعنی ''یہ کب ہوگا؟'' کا تعلق ہے' ہمیں قرآن حکیم سے بھی اس سوال کے دو جواب ملتے ہیں' چنانچہ پہلا جواب تو وہی ہے جو سورۂ بنی اسرائیل کی اسی آیت (۵۱) میں بایں الفاظ وارد ہوا ہے: ﴿قُلْ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ قَرِيْبًا ۵۱﴾ یعنی ''(اے نبی ﷺ!) کہہ دیجیے کہ عین ممکن ہے کہ وہ بالکل ہی قریب آ گیا ہو!'' بالکل اسی طرح کی ایک بات سورۃ المعارج میں بھی وارد ہوئی ہے: ﴿اِنَّهُمْ يَرَوْنَهٗ بَعِيْدًا ۶ وَّنَرٰىهُ قَرِيْبًا ۷﴾ یعنی ''یہ لوگ اسے دور سمجھ رہے ہیں جب کہ ہم اسے بالکل قریب دیکھ رہے ہیں!'' اور دوسرا وہ عمومی جواب ہے جو قرآن حکیم میں متعدد بار آیا ہے' یعنی یہ کہ: ﴿وَاِنْ اَدْرِيْٓ اَقَرِيْبٌ اَمْ بَعِيْدٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ ۱۰۹﴾ (الانبیاء) یعنی ''(اے نبی ﷺ! کہہ دیجیے کہ) میں نہیں جانتا کہ جس چیز کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے وہ قریب آ چکی ہے یا ابھی دور ہے!'' اور ﴿قُلْ اِنْ اَدْرِيْٓ اَقَرِيْبٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ اَمْ يَجْعَلُ لَهٗ رَبِّيْٓ اَمَدًا ۲۵﴾ (الجن) یعنی ''(اے نبی ﷺ!) کہہ دیجیے کہ میں نہیں جانتا کہ جس چیز کا وعدہ تم سے کیا جا رہا ہے وہ عنقریب پیش آنے والی ہے یا ابھی میرا ربّ اس کے ضمن میں کچھ تاخیر فرمائے گا!''

بہر حال سورۂ بنی اسرائیل کی محولہ بالا آیت کے مطابق میری رائے بھی یہی ہے کہ پہلے پاکستان اور افغانستان' اور پھر کل روئے ارضی پر دینِ محمد ﷺ کا غلبہ اب زیادہ دُور کی بات نہیں ہے۔ (اگرچہ دونوں مؤخر الذکر آیات کے مطابق اس کا حتمی علم صرف اللہ کو ہے) تاہم میرے تردّد کی بنیاد یہ ہے کہ تاحال اس کے آثار کہیں دور دور تک بھی نظر نہیں آ رہے۔ بلکہ ہم بحیثیت قوم وملت روز بروز سورۂ آل عمران کی آیت ۱۶۷ میں

وارد اِن الفاظ کے زیادہ سے زیادہ مصداق بنتے چلے جارہے ہیں: ﴿هُمْ لِلْكُفْرِ يَوْمَئِذٍ اَقْرَبُ مِنْهُمْ لِلْاِيْمَانِ ﴾ (وہ اُس روز ایمان کے مقابلے میں کفر سے قریب تر تھے!) اور واقعہ یہ ہے کہ اگر میرے سامنے حیاتِ نبویؐ اور سیرتِ مطہرہ کا ایک خاص مرحلہ نہ ہوتا تو ع ''اُڑتے اُڑتے دُور اُفق پر آس کا پنچھی ڈوب گیا!'' کے مصداق میری اُمید کب کی دم توڑ چکی ہوتی۔ اس لیے کہ میں بحمد اللہ خوب اچھی طرح محسوس کرسکتا ہوں کہ سن دس نبویؐ میں جناب ابوطالب کے انتقال کے بعد عالم اسباب کے اعتبار سے مکہ مکرمہ میں نبی اکرم ﷺ کے لیے واحد امان اُٹھ گئی اور کفارِ مکہ کے لیے نبی اکرم ﷺ کے قتل کی راہ میں کوئی رکاوٹ باقی نہ رہی' چنانچہ آپؐ اپنی دعوت اور تحریک کے لیے کسی متبادل مرکز کی تلاش میں طائف تشریف لے گئے۔ لیکن وہاں آپ ﷺ کو ایک دن میں وہ سختی جھیلنی پڑی جس کا سامنا اس سے قبل مکہ میں پورے دس سال کے دوران میں ذاتی طور پر آپؐ کو کبھی نہیں ہوا تھا۔ چنانچہ واپسی پر آپ ﷺ کی زبانِ مبارک پر وہ دلدوز فریاد بھی آئی جو حدیث اور سیرت کی کتابوں میں محفوظ ہے' اور پھر اسی مایوسی کے عالم میں جب آپؐ مکہ واپس تشریف لائے تو سردارانِ قریش میں سے کسی کی امان حاصل کیے بغیر مکہ میں داخلہ ممکن نظر نہ آیا۔ چنانچہ دو اشخاص کی جناب سے آپؐ کی فرمائش کا کورا جواب ملنے کے بعد بالآخر ایک کافر و مشرک لیکن شریف النفس انسان مطعم بن عدی اپنے چھ ہتھیار بند بیٹوں کے ہمراہ مکہ سے باہر آیا اور آپؐ کے لیے اپنی امان کا اعلان کرتے ہوئے آپؐ کو ساتھ لے کر مکہ میں داخل ہوا —— تو اُس وقت نہ آپؐ کی دعوت کے پنپنے کا کوئی امکان کسی کو نظر آسکتا تھا' نہ آپؐ کی کامیابی کے لیے امید کی کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ کرن کسی کو دکھائی دے سکتی تھی! اس کے باوجود کل دس سال کی مدت میں انقلابِ عظیم برپا ہو گیا اور چشم گیتی نے وہ نظارہ دیکھ لیا کہ آپؐ ۱۰ رمضان المبارک سن ۸ ہجری کو اسی مکہ مکرمہ میں اپنے دس ہزار ساتھیوں کے جلو میں فاتح کی حیثیت سے داخل ہوئے۔ گویا اللہ کی قدرت سے کچھ بھی بعید نہیں ہے۔ چنانچہ صرف اسی کے فضل و کرم کے سہارے اور

اسی کی قدرتِ کاملہ کی بنا پر میری یہ امید قائم ہے کہ ان شاء اللہ اسی سرزمین پاکستان و افغانستان سے اس عمل کا آغاز ہوگا جس کے نتیجے میں عالمی سطح پر ع ''شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے'' اور ع ''یہ چمن معمور ہوگا نغمۂ توحید سے!'' کی کیفیت پیدا ہو کر رہے گی! (واضح رہے کہ مطعم بن عدی حالتِ کفر ہی میں فوت ہو گیا تھا لیکن آنحضور ﷺ کو اس کے احسان کا اس درجہ پاس تھا کہ آپؐ نے غزوۂ بدر کے بعد قریش کے ستر قیدیوں کے بارے میں فرمایا تھا کہ: ''اگر آج مطعم زندہ ہوتا اور وہ ان کی سفارش کرتا تو میں ان سب کو بغیر کسی فدیے اور تاوان کے رہا کر دیتا!'')

اس ''گمانِ غالب'' یا امید واثق (جس کی سرحدیں ''یقین'' سے جا ملتی ہیں) کے اظہار کے بعد کہ ان شاء اللہ العزیز اسلام کے عالمی غلبے اور کل روئے ارضی پر نظامِ خلافت علیٰ منہاج النبوت کے قیام کا نقطۂ آغاز ارضِ پاکستان اور اس سے ملحق افغانستان کا وہ علاقہ بنے گا جو ماضی میں خراسان کہلاتا تھا اب آیئے اس دوسرے سوال کی جانب جس کے جواب کے بارے میں یہ عرض کر چکا ہوں کہ میں بہت متردّد ہوں یعنی یہ کہ آیا پاکستان میں یہ عظیم انقلاب ''کسی سقوطِ مشرقی پاکستان جیسے یا اس سے بھی عظیم تر سانحے یا حادثے کے بعد ہوگا یا اس سے قبل کسی خارجی افتاد کے بغیر ہی رضا کارانہ توبہ کے ذریعے ہو جائے گا؟'' تو واقعہ یہ ہے کہ اس کے بارے میں اپنے حقیقی احساسات اور خدشات کے اظہار اور انہیں نوکِ زبان یا نوکِ قلم پر لانے سے شدید خوف محسوس ہوتا ہے اس لیے کہ تلخ حقائق کو تو تسلیم کرنا بھی بہت مشکل ہوتا ہے کجا ان کا مواجہہ کرنا (یعنی انہیں ''face'' کرنا) کہ وہ تو بہت ہی دل گردے کا کام ہے۔ جب کہ عام طور پر لوگوں کا طرزِ عمل اس روایتی کبوتر ہی کا ہوتا ہے جو بلی کو سامنے دیکھ کر آنکھیں بند کر لینے میں عافیت محسوس کرتا ہے۔ (حالانکہ ظاہر ہے کہ اس سے خطرہ تو نہیں ٹل جاتا اور حقیقت تو نہیں بدل جاتی!) لہٰذا شدید اندیشہ ہے کہ میرے خیالات کو قنوطیت اور یاس پسندی سے تعبیر کیا جائے گا اور بہت سے دانشور انہیں ''منفی سوچ'' کا مظہر قرار دیں گے۔ تاہم ع ''مجھے ہے حکم اذاں لا الٰہ الاّ

اللہ'' ! کے مصداق میں یہ عرض کرنے پر مجبور ہوں کہ ہم بحیثیت ملک وقوم عذابِ الٰہی کے دوسرے اور شدید تر کوڑے کے بہت قریب پہنچ چکے ہیں۔ اور

''ہم نے تو جہنم کی بہت کی تدبیر لیکن تری رحمت نے گوارا نہ کیا!''

کے مصداق ہم اپنے اعمال کے اعتبار سے تو ''عذاب اکبر'' کے قطعی مستحق ہو چکے ہیں' یہ دوسری بات ہے کہ اللہ اپنے خصوصی فضل وکرم کے طفیل ہمیں قومِ یونس علیہ السلام کی سی توبہ کی توفیق عطا فرما دے۔ (اللہ سے دعا ہے کہ ایسا ہی ہو!)

کچھ عرصہ قبل انہی کالموں میں ''قرآن کا قانونِ عذاب'' کے موضوع پر مفصل گفتگو ہو چکی ہے' جس کے سلسلے میں سورۃ السجدۃ کی آیت ۲۱ کا حوالہ بھی آیا تھا' جس میں اللہ تعالیٰ نے اپنا یہ مستقل ضابطہ بیان فرمایا ہے کہ وہ کسی قوم پر آخری ''عذابِ استیصال'' سے قبل یعنی اس عذاب سے پہلے جس کے ذریعے اس کا نام ونشان مٹا دیا جائے' چھوٹے عذاب نازل فرماتا ہے' تاکہ اگر وہ ہوش میں آ سکتی ہو تو آ جائے اور توبہ وانابت کی روش اختیار کر کے ''عذابِ اکبر'' سے بچ جائے۔ مزید برآں اس عذاب استیصال کے بارے میں یہ بات بھی واضح کی جا چکی ہے کہ چونکہ یہ صرف ان قوموں پر نازل کیا جاتا رہا ہے جن کی جانب اللہ کے رسول مبعوث ہو کر اتمامِ حجت کا حق ادا کر چکے ہوں'[۱] لہٰذا نبی اکرم ﷺ پر نبوت اور رسالت کے سلسلے کے ختم ہو جانے کے بعد اس نوع کا عذاب کسی ''نئی'' قوم پر نہیں آئے گا۔ بلکہ یہ حتمی اور کلی طور پر صرف سابقہ اُمت مسلمہ یعنی یہود پر آئے گا جو اوّلاً حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو جو اُن کی جانب مبعوث کیے گئے تھے' ردّ کرنے کے باعث اس کے مستحق ہو گئے تھے' اور ثانیاً جب نبی اکرم ﷺ کی بعثت مبارکہ کے وقت انہیں ایک ''رحم کی اپیل'' کا موقع[۲] دیا گیا تو اسے بھی ضائع کرنے کے باعث حتمی اور قطعی طور پر ذلت ومسکنت' لعنت خداوندی اور غضب الٰہی کے مستوجب ہو گئے تھے۔ یہ دوسری بات ہے کہ' جیسے کہ اس سے قبل تفصیل کے ساتھ عرض کیا جا چکا ہے' ان کی اس

(۱) سورۂ بنی اسرائیل' آیت ۱۵ اور سورۃ القصص' آیت ۵۹۔
(۲) سورۂ بنی اسرائیل' آیت ۷ و ۸۔

آخری اور ’’استیصالی‘‘ سزا کی تنفیذ اس لیے مؤخر کر دی گئی کہ موجودہ اُمتِ مسلمہ کے افضل اور برتر حصے یعنی مسلمانانِ عرب پر عذاب اس مغضوب اور ملعون قوم کے ہاتھوں نازل کیا جائے تاکہ درد و الم پر توہین و تذلیل کا اضافہ ہو جائے۔ (جس کا آغاز پینتالیس سال قبل یعنی ۱۹۴۸ء میں اسرائیل کے قیام کے وقت سے ہو چکا ہے اور جس میں ’’کتاب الملاحم‘‘ میں واردشدہ پیشین گوئیوں کے مطابق مستقبل میں حد درجہ شدت پیدا ہونے والی ہے!)

رہی موجودہ اُمتِ مسلمہ یعنی اُمتِ محمد ﷺ تو اس پر کلی اور مجموعی حیثیت سے تو یہ نام ونشان مٹا دینے والا عذاب ہرگز نہیں آ سکتا‘ اس لیے بھی کہ یہ آخری اُمت ہے اور اسے تا قیامِ قیامت باقی رہنا ہے۔ (جیسے کہ آنحضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: ’’میں آخری رسول ہوں اور تم آخری اُمت ہو!‘‘) اور اس لیے بھی کہ اس کا اصل جرم بے عملی یا بدعملی ہے‘ رسول ﷺ کی رسالت کا انکار نہیں! تاہم اس بے عملی و بدعملی اور بدعہدی و بے وفائی کی پاداش میں کسی مخصوص خطے اور علاقے سے اس کا نام ونشان مٹا دیا جانا ہرگز بعید از قیاس نہیں ہے۔ چنانچہ ہسپانیہ کی تاریخ اس کا مُنہ بولتا ثبوت ہے کہ وہ سرزمین جس پر مسلمانوں نے آٹھ سو سال تک حکومت کی‘ وہاں سے ع ’’مٹے نامیوں کے نشان کیسے کیسے!‘‘ کے مصداق اسلام اور مسلمانوں کا نام ونشان مٹے پورے پانچ سو برس ہو گئے ہیں۔ **فَاعْتَبِرُوْا یَا اُولِی الْاَبْصَار!**

ان سطور کے ناچیز راقم نے اب سے ساڑھے چھ سال قبل (جنوری ۱۹۸۷ء میں) اپنی تالیف ’’استحکامِ پاکستان اور مسئلہ سندھ‘‘ شائع کی تو اس کے ذیلی سرورق پر یہ الفاظ تحریر کیے تھے:

> ’’۱۹۹۳ھ مطابق ۷۱۲ء میں اسلام بیک وقت برِّعظیم ہند میں براستہ سندھ‘ اور براعظم یورپ میں براستہ سپین داخل ہوا تھا۔ سپین سے اسلام اور مسلمانوں کا خاتمہ ہوئے پانچ سو برس ہو چکے ہیں۔ کیا اب

وہی تاریخ سندھ میں بھی دہرائی جانے والی ہے؟

آگ ہے‘ اولادِ ابراہیمؑ ہے‘ نمرود ہے
کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے؟‘‘

اور آج راقم گہرے درد و رنج کے ساتھ یہ عرض کرنے پر اپنے آپ کو مجبور پا رہا ہے کہ ان ساڑھے چھ سال کے دوران وقت کے دریا میں جو مزید پانی بہہ گیا ہے اس کے نتیجے میں نہ صرف پاکستان بلکہ پورے برعظیم پاک و ہند میں اسلام اور مسلمانوں کے مستقبل کو شدید خطرات لاحق ہو گئے ہیں! اس لیے کہ ایک جانب اس تلخ حقیقت سے اختلاف کی کسی بھی شخص کے لیے ذرہ بھر گنجائش نہیں ہے کہ ہم نے ۱۹۷۱ء کے ’’عذابِ ادنیٰ‘‘ سے کوئی سبق حاصل نہیں کیا۔ اور ڈھاکہ کے سقوط‘ ملک کے دولخت ہونے‘ مشرقی پاکستان کی بنگلہ دیش کی صورت میں قلب ماہیت‘ اور ان سب پر مستزاد ان ہندوؤں کے ہاتھوں شرمناک اور ذلت آمیز شکست اور ترانوے ہزار مسلمانوں کی اسیری جن پر کہیں چھ سو‘ کہیں آٹھ سو اور کہیں ایک ہزار برس تک حکومت کی تھی (جس پر اندرا گاندھی کو یہ کہنے کا موقع ملا کہ ’’ہم نے اپنی ہزار سالہ شکست کا بدلہ چکا لیا ہے!‘‘) کے نتیجے میں نہ ہماری قومی اور اجتماعی روش میں کوئی تبدیلی آئی‘ نہ ہی افراد کی ترجیحات یا مشاغل میں سرِ مو فرق واقع ہوا‘ بلکہ بحیثیتِ مجموعی ہم ہر اعتبار سے زوال اور اضمحلال ہی کی جانب رواں دواں ہیں۔ چنانچہ ہمارا داخلی انتشار ہے کہ روز بروز بڑھتا چلا جا رہا ہے‘ تا آنکہ حالیہ سیاسی بحران کے دوران میں بعض دوسرے سیاسی اور قومی رہنماؤں کے اسی نوع کے بیانوں کے علاوہ خان ولی خان کا یہ ’’عریاں‘‘ بیان بھی شائع ہو چکا ہے کہ ’’معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان ختم ہو چکا ہے!‘‘ اسی طرح معیشت ہے کہ تباہی کے آخری کنارے کو پہنچا چاہتی ہے۔ قوم کے منتخب نمائندوں کو اب ’’بکاؤ گھوڑوں‘‘ سے بڑھ کر ’’لوٹوں‘‘ کا نام دیا جا رہا ہے۔ حالیہ چپقلش کے ضمن میں صدرِ مملکت کو سرعام گالیاں دی گئیں اور ان کے نت نئے کارٹون اور کیری کیچر شائع ہوئے۔ اس سے بھی بڑھ کر عدلیہ پر کھلے بندوں

فقرے چست کیے گئے‘ حتیٰ کہ اعلیٰ عدالتوں پر پتھراؤ بھی ہوا۔ الغرض واقعتاً ایسے محسوس ہوتا ہے کہ ہم قومی اور ملکی اعتبار سے ؎

’’اس کی بربادی پہ آج آمادہ ہے وہ کارساز
جس نے اس کا نام رکھا تھا جہانِ کاف و نوں!‘‘

کی حد کو پہنچ چکے ہیں۔ جب کہ دوسری طرف بین الاقوامی سیاست میں زمین و آسمان کا فرق واقع ہو چکا ہے۔ دنیا دو سپر پاورز کی کشاکش کی آماجگاہ ہونے کی بجائے ایک ’’سول سپریم پاور‘‘ کے حیطۂ اقتدار میں آ چکی ہے۔ چنانچہ اب کمزور قوموں اور چھوٹے ملکوں کے options بہت محدود ہو چکے ہیں۔ اور اِدھر ہم جس کی دوستی کا دم بھرتے رہے اور جس کی حمایت کے سہارے جیتے رہے‘ بلکہ جس کے گھڑے کی مچھلی بنے رہے (یعنی امریکہ)‘ وہ نہ صرف یہ کہ ؏ ’’آں قدح بشکست وآں ساقی نہ ماند!‘‘ کا مصداقِ کامل بن گیا ہے‘ بلکہ اب ہر اعتبار سے بھارت کو ترجیح دینے کی پالیسی کے ناطے ؏ ’’جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے!‘‘ کا مظہرِ اَتم بن گیا ہے۔ اور صرف ہمارے لیے ہی نہیں‘ پوری دنیا میں اسلام اور مسلمانوں کے مستقبل کے اعتبار سے خطرناک ترین اور خوفناک ترین امر یہ ہے کہ اس ’’سول سپریم پاور آن ارتھ‘‘ کی پالیسیوں کی تشکیل اور فیصلوں کی تعیین میں یہودیوں کو فیصلہ کن اثر ونفوذ حاصل ہے‘ جس کے نتیجے میں ’’نیو ورلڈ آرڈر‘‘ فی الواقع ’’جیو ورلڈ آرڈر‘‘ بن گیا ہے!

تیسری جانب بھارت میں متعصب ہندو ذہنیت کا جارحانہ احیاء ہے‘ جس کی شدت نے دیکھتے ہی دیکھتے طوفانی صورت اختیار کر لی ہے۔ تقسیم ہند کے بعد لگ بھگ پچیس برس تک بھارت میں ہندومت کے احیاء کے کوئی آثار نہیں تھے‘ بلکہ بھارت کی سیاسی اور سماجی زندگی پر انڈین نیشنل کانگریس کو فیصلہ کن غلبہ حاصل تھا‘ جس میں اگرچہ متعصب اور کٹر ہندو بھی یقیناً شامل تھے‘ تاہم اس کی قیادت میں فیصلہ کن عمل دخل سیکولر مزاج کے حامل لوگوں کو حاصل تھا۔ لیکن ۱۹۷۱ء میں پاکستان کے دولخت ہونے کے

باعث اس کے رعب اور دبدبے میں جو کمی آئی اس سے بھارت میں عوامی سطح پر ہندو قوم پرستی کے جذبے کو تقویت ملی اور نہ صرف بھارت میں ہندو راشٹر کے قیام بلکہ پراچین بھارت کی عظمتِ رفتہ اور سطوتِ گزشتہ کی بازیافت کی امنگ پیدا ہوئی۔

اس جلتی پر تیل کا کام اس حادثے نے کیا کہ جب اسّی کی دہائی کے آغاز میں جبری نس بندی کے ردّعمل میں مسلمان ووٹ بحیثیت مجموعی کانگریس کے خلاف پڑا تو اس پر ''جوابِ آں غزل'' کے انداز میں اگلے انتخابات میں اندرا گاندھی نے ''ہندو دیوی'' کا روپ دھار کر خالص ہندو ووٹ کے ذریعے دوبارہ اقتدار حاصل کر لیا۔ اور اس طرح بھارت میں ریاستی اور حکومتی سطح پر اور بالخصوص ذرائع ابلاغ کی وساطت سے ہندو فنڈامنٹلزم کو فروغ حاصل ہوا' جس کا نتیجہ سامنے ہے کہ بھارتیہ جنتا پارٹی (بی جے پی) جو راشٹریہ سویم سیوک سنگھ (آر ایس ایس) کے سیاسی فرنٹ کی حیثیت رکھتی ہے' بھارت میں عظیم قوت بن کر ابھری ہے اور پوری ہندی بیلٹ (راجپوتانہ' ہریانہ' اتر پردیش' مدھیہ پردیش اور گجرات) میں تو غالب سیاسی طاقت بن ہی چکی ہے' اب جنوبی بھارت میں بھی قدم جمانے کی کوشش کر رہی ہے۔ اِدھر خود آر ایس ایس کا حال یہ ہے کہ ایک جانب اب سے لگ بھگ دس برس قبل شکاگو سے جو ایک ضخیم تصنیف اس کے بارے میں "Brotherhood in Saffron" کے نام سے شائع ہوئی تھی اس میں اس کے تربیت یافتہ کارکنوں کی تعداد پچیس لاکھ بتائی گئی تھی۔ (اس پر اس عرصے میں جو اضافہ ہوا ہوگا اس کا اندازہ خود لگا لیجیے!) دوسری جانب اس کی مستقل مزاجی کا عالم یہ ہے کہ ستر برس کے لگ بھگ عرصہ اس کے قیام کو ہونے کو آیا' لیکن اس نے کبھی انتخابات میں شریک ہو کر ''پاور پالیٹکس'' میں وقت ضائع کرنا ہرگز گوارا نہیں کیا' بلکہ ساری توجہ کو پوری تندہی کے ساتھ اپنے کارکنوں کی تنظیم' تربیت اور سماجی خدمت کے کاموں پر مرکوز رکھا۔ (واضح رہے کہ یہ جماعت قائم بھی خاکسار تحریک کے ردّعمل ہی میں ہوئی تھی۔) اور تیسری جانب اس کے کارکنوں کے نظم وضبط کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ دسمبر ۱۹۹۲ء کے

پہلے ہفتے میں ان کے تین لاکھ کارکن بابری مسجد کو گرانے کے لیے ایودھیا میں جمع ہوئے‘ اور ظاہر ہے کہ وہ بھارت کے کونے کونے سے طویل سفر طے کر کے آئے تھے‘ لیکن مسجد کے شہید کیے جانے تک کہیں ان کے کارکنوں کے مشتعل ہو کر کسی مسلمان کی جان‘ مال یا عزت پر ہاتھ ڈالنے کا کوئی واقعہ نہیں ہوا۔ چنانچہ اب بھارت میں اسلام اور مسلمانوں کی موجودہ صورت حال اور مستقبل کے اندیشوں کا اندازہ اس سے لگا لیجیے کہ شنید ہے کہ اس عظیم تنظیم کے رہنما (گورو) دیورس نے حال ہی میں ایک گشتی مراسلہ بھارت کی تمام ہندو سیاسی‘ سماجی اور مذہبی تنظیموں کو ارسال کیا ہے‘ جس میں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ:

> ”اب ہمیں بھارت کی پاک زمین سے مسلمانوں کی نجاست کو حتمی طور پر ختم کرنے کا آخری فیصلہ کر گزرنا چاہیے۔ اور میں آپ سب کو اطمینان دلاتا ہوں کہ اس پر کچھ معمولی سا ردّعمل پاکستان اور بنگلہ دیش میں تو ہوسکتا ہے‘ جس کی ہمیں پرواہ کرنے کی ضرورت نہیں‘ باقی پوری دنیا کے مسلمانوں سے کسی ناموافق ردّعمل کا کوئی اندیشہ نہیں ہے!“

اندریں حالات بھارت کا مسلمان تو مسلسل خوف کی حالت سے دوچار ہے ہی‘ (اس لیے کہ اسے تو مسلسل یہ نعرہ سننا پڑتا ہے کہ ”مسلمان کے دو استھان: پاکستان یا قبرستان!“) لیکن جگر کے اس شعر کے مصداق کہ: ؎

”آسودۂ ساحل تو ہے مگر شاید یہ تجھے معلوم نہیں
ساحل سے بھی موجیں اٹھتی ہیں‘ خاموش بھی طوفاں ہوتے ہیں!“

ہم مسلمانانِ پاکستان کو بھی کسی مغالطے میں مبتلا نہیں رہنا چاہیے۔ اس لیے کہ ایک جانب بھارت کے ہندو فنڈامنٹلزم کا علاقائی عملداری کا دعویٰ انڈونیشیا سے افغانستان تک‘ معاشی استحصال کی امنگیں اس سے بھی آگے ایران وعرب تک‘ اور بحری بالادستی کا عزم پورے بحر ہند پر یعنی آسٹریلیا سے افریقہ تک ہے۔ اور دوسری طرف بھارت اسرائیل گٹھ جوڑ اور ہنود و یہود کا اشتراکِ عمل بڑی تیزی کے ساتھ رسمی اور روایتی سفارتی تعلقات

سے بہت آگے بڑھ رہا ہے! اور اسرائیل اچھی طرح جانتا ہے کہ اس کے توسیعی عزائم یعنی عظیم تر اسرائیل کے قیام کی راہ میں واحد مسلمان ملک جو مزاحم ہو سکتا ہے وہ صرف پاکستان ہے، جس کے ایٹمی دانت یا نکل چکے ہیں یا نکلنے کا اندیشہ ہے! اور تیسری جانب امریکہ وسطی ایشیا کی نو آزاد مسلمان ریاستوں کے سیاسی، معاشی یہاں تک کہ سماجی روابط بھی مغرب میں اسرائیل اور سیکولر ترکی اور مشرق میں بھارت کے ساتھ استوار کرانے کی سرتوڑ کوشش کر رہا ہے۔ الغرض، ان جملہ داخلی و خارجی عوامل کا ''حاصل جمع'' اقبال کے الفاظ میں یہ ہے کہ ع ''تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں!'' اور ہم بحیثیتِ ملک و قوم اس وقت بالکل اسی صورت حال سے دوچار ہو چکے ہیں جس کے پیش نظر بخت نصر کے ہاتھوں عظیم سلطنت اسرائیل اور مقدس شہر یروشلم کی کامل تباہی سے قبل انبیاء بنی اسرائیل اپنی قوموں کو ان الفاظ میں متنبہ کرتے رہے تھے کہ: ''ہوش میں آ جاؤ، ورنہ جان لو کہ درخت کی جڑوں پر کلہاڑا رکھا جا چکا ہے!''

(۲۰ر جولائی ۱۹۹۳ء)

باب پانزدھم

ہماری نجات کا واحد ذریعہ

اجتماعی توبہ

جو کچھ گزشتہ صحبت میں عرض کیا گیا تھا اس کے پیش نظر اس انگریزی مقولے کے مطابق کہ ''امید تو بہترین کی کرو' لیکن تیار بدترین کے لیے رہو!'' اس خطۂ ارضی کے مستقبل کے بارے میں' جس میں پاکستان واقع ہوا ہے' بہترین سے بدترین تک تین ممکنہ صورتیں نظر آتی ہیں:

پہلی صورت جو نہایت خوش آئند اور تابناک ہے' یہ کہ

''پھر دلوں کو یاد آ جائے گا پیغامِ سجود
پھر جبیں خاکِ حرم سے آشنا ہو جائے گی!''

کے مصداق ملتِ اسلامیہ پاکستان کو قومِ یونسؑ کی سی توبہ کی توفیق مل جائے۔ چنانچہ اوّلاً افراد و اشخاص کی ایک معتد بہ تعداد اللہ کے حضور میں سچی اور خالص توبہ کرے' اور ایک جانب اپنے عقائد کی تصحیح کرے اور توحید خالص کا دامن از سرِ نو مضبوطی کے ساتھ تھامے' دوسری جانب فسق و فجور کو ترک کرے اور اپنی معیشت اور معاشرت کو حرام اور منکر سے پاک کرے' اور تیسری جانب غلبۂ اسلام اور قیامِ نظامِ خلافت کی منظّم جدوجہد کے لیے تن من دھن وقف کر دے۔ ثانیاً اس طرح جو منظّم قوت وجود میں آئے وہ ملکی سیاست اور اقتدار کی کشاکش سے بالکل علیحدہ رہتے ہوئے اپنی جملہ مساعی اور تمام تر توانائیوں کو مزاحمتی تحریک کے لیے وقف کر دے' اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے ضمن میں فطری تدریج کے ساتھ ''بِـالـلِّسـان'' یعنی زبان اور نشر و اشاعت کے دیگر ذرائع سے تدریجاً

آگے بڑھ کر ''بِـــالیَـد''یعنی قوت کے ساتھ مزاحمت کی راہ اختیار کرے' اور اس طرح ارضِ پاکستان پر اللہ کے دین کو غالب اور اسلام کے نظامِ عدلِ اجتماعی کو نافذ کر دے۔ اگر ایسا ہو جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ نہ صرف یہ کہ قیام پاکستان کے لیے جو قربانیاں مسلمانانِ ہند نے دی تھیں وہ رائیگاں نہیں گئیں' بلکہ الف ثانی کی جملہ چار سو سالہ تجدیدی مساعی بھی بار آور ہو گئیں۔ اس لیے کہ اس صورت میں ارضِ پاکستان کو فوری طور پر اسلام کی نشأۃِ ثانیہ کا گہوارہ اور عالمی غلبۂ اسلام کا نقطۂ آغاز بننے کی سعادت حاصل ہو جائے گی۔ اب ظاہر ہے کہ ہر مسلمان کی دلی خواہش بھی یہی ہوگی کہ ایسا ہو جائے' اور اسی کی دعا بھی ہر قلب کی گہرائی سے بلند ہوگی' اور ''جب تک سانس تب تک آس!'' کے مطابق ہمیں آخری دم تک کوشش بھی اسی کی کرنی چاہیے۔ لیکن یہ حقیقت بھی اظہر من الشّمس ہے کہ اس کے کچھ ناگزیر لوازم و شرائط ہیں جن کا اجمالی ذکر اوپر بھی ہو چکا ہے اور کسی قدر وضاحت سے آگے دوبارہ ہوگا۔

دوسری ممکنہ صورت یہ ہے کہ چونکہ سرزمین مشرقی پاکستان ہم مغربی پاکستان کے رہنے والوں کی نگاہوں سے دور تھی' اور ''آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل'' کے مصداق ۱۹۷۱ء کے ''عذابِ ادنیٰ'' کے شدائد کو ہم نے براہِ راست محسوس نہیں کیا' لہٰذا شاید کہ ہماری آنکھیں کھولنے اور ہمیں توبہ اور رجوع پر آمادہ کرنے کے لیے ایک مزید ''عذابِ ادنیٰ'' کی ضرورت ہو۔ چنانچہ جس عذاب کے سائے افق پر منڈلاتے نظر آ رہے ہیں وہ عذابِ ادنیٰ ہی کا ایک اور کوڑا ہو۔ اور اگرچہ اقبال کا یہ شعر کہ ؎

''اگر عثمانیوں پر کوہِ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے!
کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا!''

تاحال ترکوں پر تو صادق نہیں آ سکا' لیکن کیا عجب کہ ہم پر صادق آ جائے!

تیسری اور آخری' اور حد درجہ قابل حذر صورت' جو بحالاتِ موجودہ ہرگز بعید از قیاس نہیں ہے' یہ ہے کہ' خاکم بدہن' ہمیں اپنے کرتوتوں اور فروگزاشتوں کی

پاداش میں اپنے کسی دشمن کے ہاتھوں عبرتناک سزا دلوائی جائے‘ جس کے نتیجے میں نہ صرف یہ کہ [قرآن کے الفاظ ﴿لِيَسُوْٓءٗا وُجُوْهَكُمْ﴾ (بنی اسرائیل:۷) کے مطابق] ہمارے حلیے بگڑ جائیں بلکہ اس علاقے کا جغرافیہ ہی بدل جائے‘ اور عظیم سلطنت عثمانیہ اور عظیم سوویت یونین کے مانند‘ اور ع ’’تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں!‘‘ کے مصداق ’’سلطنتِ خداداد پاکستان‘‘ کا نام ونشان بھی دنیا کے نقشے سے حرفِ غلط کی طرح مٹ کر رہ جائے!

اللہ نہ کرے ایسا ہو‘ اور اگرچہ قرائن اور شواہد کے اعتبار سے تو اب معاملہ ایک انگریزی محاورے کے مطابق ’’امید کے خلاف امید‘‘ (Hoping against hope) کا ہے‘ تاہم مجھے اب بھی امید ہے کہ اِن شاء اللہ ایسا نہیں ہوگا۔ لیکن اگر خدانخواستہ ایسا ہو گیا تب بھی میری یہ ’’امید واثق‘‘ اپنی جگہ برقرار رہے گی کہ عالمی غلبۂ اسلام اور کل روئے ارضی پر نظامِ خلافت علیٰ منہاج النبوت کا قیام‘ جو تقدیر مبرم کے مانند اٹل ہے‘ اسی خطۂ ارضی سے شروع ہوگا۔ اس لیے کہ ؎

’’ہے عیاں فتنۂ تاتار کے افسانے سے
پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے!‘‘

کے مصداق تاریخ اپنے آپ کو دہرا سکتی ہے۔ اور جس طرح اب سے لگ بھگ سات آٹھ سو سال قبل اللہ تعالیٰ نے عربوں کو تاتاریوں کے ہاتھوں پٹوایا‘ اور پھر خود اُن کو اسلام کی توفیق عطا کر کے عالم اسلام کی قیادت سونپ دی‘ اسی طرح عین ممکن ہے کہ ہمارا کوئی دشمن ہمیں فتح کر لے لیکن پھر خود اسلام کے ہاتھوں مفتوح ہو جائے! اس لیے کہ بعض ایسے حضرات جن کی نگاہ ایک جانب تاریخ اور رفتارِ زمانہ پر بھی ہے‘ اور دوسری جانب قرآن اور دیگر کتبِ سماویہ کے علاوہ ہندوستان کی قدیم مذہبی کتابوں پر بھی‘ یہ رائے رکھتے ہیں کہ اُمتِ مسلمہ کی قیادت جو اوّلاً عربوں کو عطا کی گئی تھی‘ جو حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے حضرت سام کی نسل سے تھے‘ پھر ترکوں کو منتقل کر دی گئی تھی جو حضرت نوح علیہ السلام کے دوسرے بیٹے حضرت یافث کی نسل سے تھے‘ اب جنوبی ایشیا کے ان لوگوں کو منتقل ہونے والی ہے جو

حضرت نوح علیہ السلام کے تیسرے بیٹے یعنی حضرت حام کی نسل سے ہیں۔ واللہ اعلم!

بہرصورت‘ جیسے کہ اوپر عرض کیا گیا‘ ہمارا فرض یہ ہے کہ

’’سنبھلنے دے مجھے اے ناامیدی کیا قیامت ہے

کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے!‘‘

کے مصداق دامن امید کو حتی الامکان مضبوطی کے ساتھ تھامے رکھنے کی کوشش کریں‘ اور ع ’’پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ!‘‘ کے مطابق چمن پاکستان میں ’’چمن سے روٹھی بہار‘‘ کو واپس لانے کی ہر ممکن سعی کریں اور اس سلسلے میں قومِ یونس علیہ السلام کی مثال ہمارے لیے بہت ہمت افزا ہے۔ چنانچہ سورۂ یونس کی آیات ۹۶ تا ۹۸ میں واضح طور پر بیان کیا گیا ہے کہ اگرچہ اللہ تعالیٰ کا مستقل قانون تو یہی ہے کہ جس طرح کسی انسان پر موت کے آثار شروع ہو جانے کے بعد توبہ کا دروازہ بند ہو جاتا ہے‘ اسی طرح کسی قوم پر آخری اور بڑے عذاب کے آثار شروع ہونے کے بعد اس کے ایمان لانے یا توبہ کرنے سے عذاب نہیں ٹالا جاتا‘ لیکن اس قاعدۂ کلیہ میں ایک استثناء کا معاملہ حضرت یونس علیہ السلام کی قوم کے ساتھ ہوا کہ ان کی توبہ عذابِ استیصال کے آثار شروع ہونے کے بعد بھی قبول کر لی گئی۔ تو اگرچہ قومِ یونس علیہ السلام کے ضمن میں تو اس استثناء کا سبب کچھ اور تھا‘ تاہم چونکہ ہم پر فی الوقت کسی رسول کے ذریعے اتمامِ حجت نہیں ہوا ہے‘ لہٰذا ہم بھی اللہ تعالیٰ کی شانِ غفاری سے استغاثہ کرنے کے مستحق ہیں‘ اور توقع کر سکتے ہیں کہ اگر ہم سچی توبہ (توبۂ نصوح) کا حق ادا کر دیں تو آنے والا عذاب ٹل سکتا ہے۔

البتہ کسی قوم کو دنیا میں اس ’’رسوا کن عذاب‘‘ سے نجات پا کر ایک نئی ’’مہلتِ حیات‘‘ کی حق دار قرار دینے والی ’’توبہ‘‘ کے کچھ لوازم و شرائط ہیں‘ جن کا فہم و ادراک ضروری ہے:

۱) اوّلاً یہ کہ اگرچہ ’’اجتماعی توبہ‘‘ کا نقطۂ آغاز لامحالہ انفرادی توبہ ہی ہوتی ہے‘ لیکن انفرادی توبہ کے ذریعے صرف اُخروی عذاب سے نجات کی ضمانت مل سکتی ہے‘ اور وہ بھی صرف اس صورت میں کہ وہ واقعی ’’توبۂ نصوح‘‘ ہو جس کی آیاتِ قرآنی اور

احادیثِ نبویہؐ کی روشنی میں جو شرائط معین کی گئی ہیں وہ حقوق اللہ کے ضمن میں ہونے والی تقصیرات کے معاملے میں تو تین ہیں' لیکن حقوق العباد سے متعلق گناہوں کے معاملے میں چار ہیں۔ یعنی ان دونوں قسم کے گناہوں کے ضمن میں تو یہ تین شرائط مشترک ہیں کہ: (i) ایک یہ کہ حقیقی اور واقعی ندامت موجود ہو' بقول اقبال:

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لیے
قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے!

(ii) دوسرے یہ کہ آئندہ کے لیے عزمِ مصمم ہو کہ اس گناہ کا ارتکاب کبھی نہیں کروں گا۔
(iii) تیسرے یہ کہ بالفعل بھی اس گناہ کو واقعتاً ترک کر دے۔ اور ان پر مستزاد حقوق العباد کے ضمن میں ایک چوتھی اضافی شرط یہ ہے کہ شخص متعلق کا جو حق تلف یا غصب کیا تھا اس کی تلافی کرے' یا بصورتِ دیگر اس سے معافی حاصل کرے! (ورنہ قیامت کے دن حساب کتاب کے وقت ظالم کی نیکیاں مظلوم کو دی جائیں گی یا مظلوم کی برائیاں ظالم کے حساب میں شمار ہوں گی۔)

۲) یہ ''انفرادی توبہ'' خواہ کتنی ہی سچی ہو اور انسان ذاتی اعتبار سے خواہ کتنا ہی متقی وصالح اور عابد و زاہد کیوں نہ بن جائے' اگر قوم کی مجموعی حالت تبدیل نہ ہو اور وہ بحیثیت مجموعی عذابِ خداوندی کی مستحق بن جائے تو جس طرح چکی میں گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس جاتا ہے' اسی طرح جب کسی قوم پر دنیا میں اجتماعی عذاب آتا ہے تو اس کی لپیٹ میں بدکاروں اور بدمعاشوں کے ساتھ ساتھ بے گناہ لوگ بھی آ جاتے ہیں' جیسے کہ سورۃ الانفال کی آیت ۲۵ میں فرمایا:

﴿وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً ۚ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۲۵﴾﴾

''اور ڈرو اُس عذاب سے جو تم میں سے صرف بدکاروں اور گناہ گاروں ہی پر نہیں آئے گا' اور جان لو کہ اللہ سزا دینے میں بہت سخت ہے!''

(اس قاعدۂ کلیہ میں بھی ایک استثناء موجود ہے جس کا ذکر آگے آ رہا ہے)— اس سے بھی زیادہ قابل حذر معاملہ وہ ہے جو ایک حدیثِ مبارک میں بیان ہوا ہے جس کا ترجمہ یہ ہے:

''اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام کو حکم دیا کہ فلاں اور فلاں بستیوں کو اُن کے رہنے والوں سمیت الٹ دو۔ اس پر حضرت جبرئیل علیہ السلام نے بارگاہِ خداوندی میں عرض کیا کہ پروردگار! اس میں تو تیرا فلاں بندہ بھی رہتا ہے جس نے آج تک کبھی پلک جھپکنے جتنی دیر بھی معصیت میں بسر نہیں کی۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: الٹ دو اس بستی کو پہلے اس پر اور پھر دوسروں پر' اس لیے کہ (اپنی تمام تر ذاتی نیکی اور پارسائی کے باوصف' اس کی دینی بے حمیتی کا حال یہ ہے کہ میرے دین و شریعت کی حمایت وحفاظت میں کوئی عملی سعی و جہد تو درکنار) میری غیرت کے باعث کبھی اس کے چہرے کا رنگ بھی متغیر نہیں ہوا!'' (سنن بیہقیؒ)

۳) دنیا میں کسی قوم کے اللہ کے عذاب سے بچنے کی واحد صورت ''اجتماعی توبہ'' ہے۔ اور اگرچہ یہ واقعہ ہے کہ دنیا میں کسی معاشرے کے صد فی صد لوگ تو کسی بھی دور میں درست نہیں ہوئے۔ (یہاں تک کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بھی آخر دم تک کچھ نہ کچھ تعداد میں منافق ضرور موجود رہے' تا بہ دیگراں چہ رسد؟) تاہم اگر کسی قوم کے افراد اتنی معتدبہ تعداد میں سچی توبہ کرلیں کہ پھر اپنی دعوت ونصیحت اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے ذریعے قوم کے اجتماعی دھارے کا رُخ تبدیل کردیں' یعنی بالفاظِ دیگر ایک اجتماعی انقلاب برپا کرنے میں کامیاب ہوجائیں' تو اس قوم کی جانب سے ''اجتماعی توبہ'' کا حق ادا ہوجائے گا' اور وہ ''دنیا کی زندگی میں رسوا کن عذاب'' سے نجات پا کر ''نئ زندگی'' حاصل کرنے میں کامیاب ہوجائے گی۔

۴) چنانچہ کسی قوم پر اجتماعی عذاب نازل ہونے کی صورت میں اس کے نیک اور صالح افراد کے بچالیے جانے کی وہ واحد استثنائی صورت جس کا ذکر اوپر کیا گیا تھا' اور جس کی امید قرآن حکیم میں سورۃ الاعراف کی آیت ۱۶۵ میں دلائی گئی ہے' یہی ہے کہ قوم کے اجتماعی فساد کی صورت میں جو لوگ آخر دم تک ''نھی عن السُّوء'' کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگاتے رہیں' اور گویا سورۃ التوبہ کی آیت ۱۱۲ کے ان الفاظِ مبارکہ کے مصداق بن جائیں: ﴿اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ السَّآئِحُوْنَ الرّٰکِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ

اللّٰہِ ﴾ (یعنی ''توبہ کرنے والے' بندگی کا حق ادا کرنے والے' اللہ کی حمد کرنے والے' لذاتِ دُنیوی سے کنارہ کش رہنے والے' رکوع کرنے والے' سجدہ کرنے والے' نیکی کا حکم دینے والے' بدی سے روکنے والے اور اللہ کی حدود کے محافظ بن کر کھڑے ہو جانے والے'')۔ تو اگر ان کی جملہ مساعی کے باوجود قوم بحیثیت مجموعی صحیح رُخ پر نہ آئے اور اعراض واستکبار ہی پر مصر رہنے کے باعث عذابِ الٰہی کی مستحق ہو جائے تو اللہ اپنے ایسے ''نہی عن المنکر'' کا حق ادا کرنے والے بندوں کو دنیا کے رسوا کن عذاب سے بچا کر اپنے دامن رحمت میں لے لیتا ہے۔

۵) کسی مسلمان فرد یا قوم میں بے عملی یا بدعملی کا اصل سبب یقین والے ایمان کی کمی یا فقدان ہوتا ہے۔ چنانچہ اس کا علاج بھی ع ''علاج اس کا وہی آبِ نشاط انگیز ہے ساقی!'' کے مصداق یہی ہے کہ اقبال کے اس قول کے مطابق کہ ؎

''یقیں پیدا کر اے ناداں' یقیں سے ہاتھ آتی ہے
وہ درویشی کہ جس کے سامنے جھکتی ہے فغفوری!''

اُمت میں یقین والا ایمان ازسرنو پیدا کیا جائے۔ اسی حقیقت کو قرآن حکیم نے اس طرح تعبیر فرمایا کہ توبہ گویا ازسرنو ایمان لانے کا کام ہے جس کا لازمی نتیجہ عمل کی اصلاح ہے۔[1] لہٰذا قوم کی ''اجتماعی توبہ'' کے لیے اصل اور بنیادی ضرورت یہ ہے کہ تجدید ایمان کی عمومی تحریک برپا کی جائے۔ اور الحمد للہ کہ برعظیم پاک و ہند میں ایک بڑے پیمانے اور عوامی سطح پر' اگرچہ غیر علمی اور غیر فکری انداز میں' تجدید ایمان کی ایک عظیم تحریک ''تبلیغی جماعت'' کے تحت چل بھی رہی ہے' تاہم ضرورت ہے کہ اُمت کے ذہین اور فہیم عناصر میں ایسے شعوری ایمان کی افزائش کا سامان کیا جائے جس کا گہرا اور محکم

---

(۱) ازروئے الفاظ قرآنی: ﴿اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَ عَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ ؕ﴾ (الفرقان: ۷۰)
''سوائے ان کے جنہوں نے توبہ کی' اور جو ایمان لائے اور جنہوں نے بالفعل اچھے عمل کیے' تو اللہ ان کی برائیوں کو بھلائیوں سے بدل دے گا!''

رشتہ ان کے ''فکر'' کے ساتھ قائم ہو'اس لیے کہ اس کے بغیر قوم کی اجتماعی صورت حال کا بدلنا ناممکن ہے۔ چنانچہ اسی ضرورت کے احساس کے تحت علامہ اقبال نے اب سے لگ بھگ ساٹھ برس قبل ''فکر اسلامی کی تشکیل جدید'' کے عنوان سے اپنے مشہورِ زمانہ ''خطبات'' ارشاد فرمائے تھے'اور اسی ضرورت کے احساس کے تحت اب سے لگ بھگ تیس سال قبل حضرت علامہ ہی کے ایک ادنیٰ خوشہ چین کی حیثیت سے راقم الحروف نے ''رجوع الی القرآن'' کی تحریک شروع کی تھی۔ اس لیے کہ وہ بات جو مولانا ظفر علی خاں مرحوم نے نہایت سادہ الفاظ میں کہی تھی' یعنی ؎

وہ جنس نہیں ایمان جسے لے آئیں دکانِ فلسفہ سے
ڈھونڈے سے ملے گی عاقل کو یہ قرآں کے سیپاروں میں!

وہ فی الواقع ایک نہایت عظیم حقیقت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ اقبال نے اُمت مسلمہ کے جملہ امراض کا اصل سبب قرآن سے دوری کو قرار دیا اور اس کا اصل علاج ''رجوع الی القرآن'' تجویز کیا۔ چنانچہ سادہ ترین الفاظ میں تو ''جوابِ شکوہ'' میں ارشاد فرمایا: ؎

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر!

اور نہایت پرشکوہ الفاظ میں ان فارسی اشعار میں بیان کیا کہ ؎

خوار از مہجوریٔ قرآں شدی شکوہ سنجِ گردشِ دوراں شدی!

اور: ؎

اے چو شبنم بر زمیں افتندۂ در بغل داری کتابِ زندۂ!

یعنی ''اے اُمتِ مسلمہ! درحقیقت تو خوار اور زبوں حال صرف اس لیے ہوئی کہ قرآن حکیم سے اپنا تعلق توڑ بیٹھی۔ گردشِ دوراں کے شکوے خواہ مخواہ کر رہی ہے۔ اے وہ قوم جو شبنم کی طرح زمین پر پڑی ہوئی ہے (چنانچہ اغیار و اعداء تجھے پامال کر رہے ہیں) اب بھی اس ''کتابِ زندہ'' کی جانب رجوع کر لے جو تیری بغل میں موجود ہے (تو تیرے تمام امراض و علل کا مداوا ہو جائے گا اور جملہ مسائل حل ہو جائیں گے۔)'' گویا جس

طرح جبران خلیل جبران نے کہا تھا: ''عقل سے روشنی حاصل کرو اور جذبہ کے تحت حرکت کرو!'' اسی طرح ہماری ''اجتماعی توبہ'' کا نسخہ یہ ہے کہ: ''قرآن سے ایمان حاصل کرو اور ایمان کے روغن سے جہد وعمل کی شمعیں روشن کرو!''

٦) ایمانِ حقیقی کے لازمی اور منطقی نتیجے کو قرآن اکثر و بیشتر تو صرف ''عمل صالح'' کی نہایت جامع اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے' لیکن کہیں اس کے مضمرات اور متضمنات کو کھول بھی دیتا ہے۔ جیسے سورۃ العصر میں عمل صالح کے دو لوازم کو نمایاں طور پر بیان کر دیا' یعنی ''حق کی علمبرداری اور دعوت و اشاعت'' اور ''باہم ایک دوسرے کو صبر و مصابرت کی تلقین و نصیحت۔'' اور اس طرح گویا ضمنی طور پر ایک جماعتی زندگی کی اہمیت کو بھی اجاگر کر دیا۔ اسی طرح کہیں قرآن ایمان کے جملہ عملی تقاضوں کو صرف ایک جامع اصطلاح ''جہاد فی سبیل اللہ'' سے تعبیر فرما دیتا ہے' تو کہیں اس کی تفصیل دس اصطلاحات کے ذریعے کرتا ہے' جیسے کہ سورۃ التوبہ کی آیت ۱۱۲ میں تو وہ نو اوصاف بیان ہوئے جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے' اور اس سے قبل آیت ۱۱۱ میں اضافی اصطلاح ''قتال فی سبیل اللہ'' کے ذریعے ''تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ'' کے مصداق دس اوصاف کی تکمیل فرما دی۔ اس معاملے میں بھی اس حقیقت کا اعتراف و اظہار ضروری ہے کہ بحمد اللہ سورۃ التوبہ کی آیت ۱۱۲ میں بیان شدہ نو اوصاف میں سے بھی پہلے سات کا اہتمام تو بعض تصوف کے حلقوں کے علاوہ تبلیغی جماعت کے احباب بھی کر رہے ہیں۔ اب ضرورت اس امر کی ہے کہ ؎

''نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسم شبیریؓ
کہ رسم خانقاہی ہے فقط اندوہ و دل گیری!''

کے مصداق یہ سب حضرات آخری دو اوصاف یعنی ''بدی سے روکنے اور حدود اللہ کے محافظ بن کر کھڑے ہو جانے'' کا بھی اہتمام کریں اور پھر اگر ''نھی عن المنکر باللّسان'' سے آگے بڑھ کر ''نھی عن المنکر بالید'' کی عوامی تحریک کا مرحلہ بھی آ جائے اور ضرورت داعی ہو تو نقد جان ہتھیلیوں پر رکھ کر اور اللہ کے دین کی غیرت وحمیت' اور حمایت

ومحافظت میں جانیں قربان کر دینے ہی کو حاصل زندگی اور مقصد حیات سمجھ کر میدان میں آ جائیں، اور اس طرح ''اجتماعی توبہ'' کا وہ حق ادا کرنے کی کوشش کریں جو اس عذابِ الٰہی کے سایوں کو دور فرما دے جو وطن عزیز کے افق پر گہرے سے گہرے ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ اللہ ہم سب کو اس کی توفیق عطا فرمائے......آمین!

(۲۶/جولائی ۱۹۹۳ء)

ضمیمہ

اس کتاب میں مذکور

احادیث کی تخریج

زیر نظر کتاب میں جا بجا احادیث مبارکہ کے حوالے موجود ہیں، بلکہ بہت سے مباحث میں احادیث ہی کو استدلال کی بنیاد بنایا گیا ہے۔ ایسی تمام احادیث کو جو کتاب کے مرکزی مضمون سے براہ راست متعلق ہیں، ان کے متون اور حوالہ جات سمیت یہاں ہم نے جمع کرنے کی کوشش کی ہے اور اس طرح احادیث مبارکہ کا ایک خوبصورت گلدستہ تیار ہو گیا ہے۔

قیامت سے قبل عالمی غلبۂ اسلام کی نوید

عَنْ ثَوْبَانَ ؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ:

((اِنَّ اللّٰہَ زَوٰی لِیَ الْاَرْضَ فَرَاَیْتُ مَشَارِقَھَا وَمَغَارِبَھَا' وَاِنَّ اُمَّتِیْ سَیَبْلُغُ مُلْکُھَا مَا زُوِیَ لِیْ مِنْھَا)) [صحیح مسلم' کتاب الفتن و اشراط الساعة' باب ھلاك ھذه الامة بعضھم ببعض]

''اللہ نے مجھے پوری زمین کو لپیٹ کر (یا سکیڑ کر) دکھا دیا۔ چنانچہ میں نے اس کے سارے مشرق بھی دیکھ لیے اور تمام مغرب بھی۔ اور یقین رکھو کہ میری اُمت کی حکومت ان تمام علاقوں پر قائم ہو کر رہے گی جو مجھے لپیٹ کر (یا سکیڑ کر) دکھائے گئے۔''

عَنِ الْمِقْدَادِ بْنِ الْاَسْوَدِ ؓ اَنَّہٗ سَمِعَ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ یَقُوْلُ: ((لَا یَبْقٰی عَلٰی ظَھْرِ الْاَرْضِ بَیْتُ مَدَرٍ وَلَا وَبَرٍ اِلَّا اَدْخَلَہُ اللّٰہُ کَلِمَةَ الْاِسْلَامِ بِعِزِّ عَزِیْزٍ وَذُلِّ ذَلِیْلٍ —— اِمَّا یُعِزُّھُمُ اللّٰہُ عَزَّوَجَلَّ فَیَجْعَلُھُمْ مِنْ اَھْلِھَا اَوْ یُذِلُّھُمْ فَیَدِیْنُوْنَ لَھَا)) —— قُلْتُ: "فَیَکُوْنَ الدِّیْنُ کُلُّہٗ لِلّٰہِ" [رواه احمد فی "المُسند" بسند صحیح]

حضرت مقداد بن الاسود ؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا: ''دنیا میں نہ کوئی اینٹ گارے کا بنا ہوا گھر باقی رہے گا نہ کمبلوں کا بنا ہوا خیمہ جس میں اللہ اسلام کو داخل نہیں کر دے گا' خواہ عزت والے کے اعزاز کے ساتھ خواہ کسی مغلوب کی مغلوبیت کی صورت میں۔ (یعنی) یا لوگ اسلام قبول کر کے خود بھی عزت کے مستحق بن جائیں گے یا اسلام کی بالادستی تسلیم کر کے اس کی فرماں برداری قبول کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔'' میں (راوی) نے کہا: تب تو سارے کا سارا دین اللہ کے لیے ہو جائے گا۔

عَنِ النُّعْمَانِ بْنِ بَشِیْرٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمَا عَنْ حُذَیْفَةَ ؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ:

((تَکُوْنُ النُّبُوَّةُ فِیْکُمْ مَاشَاءَ اللّٰہُ اَنْ تَکُوْنَ، ثُمَّ یَرْفَعُھَا اِذَا شَاءَ اَنْ یَّرْفَعَھَا، ثُمَّ تَکُوْنُ خِلَافَةً عَلٰی مِنْھَاجِ النُّبُوَّةِ، فَتَکُوْنُ مَا شَاءَ اللّٰہُ اَنْ تَکُوْنَ، ثُمَّ یَرْفَعُھَا اِذَا شَاءَ اللّٰہُ اَنْ یَّرْفَعَھَا، ثُمَّ تَکُوْنُ مُلْکًا عَاضًّا' فَیَکُوْنُ مَا شَاءَ اللّٰہُ اَنْ یَکُوْنَ، ثُمَّ یَرْفَعُھَا اِذَا شَاءَ اَنْ

يَرْفَعَهَا، ثُمَّ تَكُوْنُ مُلْكًا جَبْرِيَّةً فَتَكُوْنُ مَا شَاءَ اللّٰهُ اَنْ تَكُوْنَ، ثُمَّ يَرْفَعُهَا اِذَا شَاءَ اَنْ يَّرْفَعَهَا، ثُمَّ تَكُوْنُ خِلَافَةً عَلٰى مِنْهَاجِ النُّبُوَّةِ)) ثُمَّ سَكَتَ [رواہ احمد]

حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہما حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''دورِنبوت تم میں اُس وقت تک رہے گا جب تک اللہ چاہے گا' پھر جب وہ اس کو ختم کرنا چاہے گا اس کو ختم کردے گا۔ پھر نبوت کی طرز پر خلافت کا دَور ہوگا' پھر وہ دَور رہے گا جب تک اللہ تعالیٰ چاہے گا' پھر وہ اس کو ختم کردے گا جب وہ اس کو ختم کرنا چاہے گا۔ پھر کاٹ کھانے والی بادشاہت ہوگی۔ وہ دور بھی اُس وقت تک رہے گا جب تک اللہ چاہے گا' پھر جب وہ اس کو ختم کرنا چاہے گا تو ختم کردے گا۔ پھر جبر کی فرماں روائی ہوگی' وہ رہے گی جب تک اللہ چاہے گا' پھر وہ اس کو ختم کردے گا جب وہ اسے ختم کرنا چاہے گا۔ پھر نبوت کے طرز پر دوبارہ خلافت قائم ہوگی''۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم خاموش ہو گئے۔

((اِنَّ اَوَّلَ دِيْنِكُمْ نُبُوَّةٌ وَرَحْمَةٌ وَتَكُوْنُ فِيْكُمْ مَاشَاءَ اللّٰهُ اَنْ تَكُوْنَ، ثُمَّ يَرْفَعُهَا اللّٰهُ جَلَّ جَلَالُهٗ، ثُمَّ تَكُوْنُ خِلَافَةً عَلٰى مِنْهَاجِ النُّبُوَّةِ مَاشَاءَ اللّٰهُ اَنْ تَكُوْنَ، ثُمَّ يَرْفَعُهَا اللّٰهُ جَلَّ جَلَالُهٗ، ثُمَّ يَكُوْنُ مُلْكًا عَاضًّا فَيَكُوْنُ مَاشَاءَ اللّٰهُ اَنْ يَكُوْنَ، ثُمَّ يَرْفَعُهَا اللّٰهُ جَلَّ جَلَالُهٗ، ثُمَّ تَكُوْنُ مُلْكًا جَبْرِيَّةً فَتَكُوْنُ مَا شَاءَ اللّٰهُ اَنْ تَكُوْنَ، ثُمَّ يَرْفَعُهَا اللّٰهُ جَلَّ جَلَالُهٗ، ثُمَّ تَكُوْنُ خِلَافَةً عَلٰى مِنْهَاجِ النُّبُوَّةِ تَعْمَلُ فِي النَّاسِ بِسُنَّةِ النَّبِيِّ صلى الله عليه وسلم وَيُلْقِي الْاِسْلَامُ بِجِرَانِهٖ فِي الْاَرْضِ يَرْضٰى عَنْهَا سَاكِنُ السَّمَاءِ وَسَاكِنُ الْاَرْضِ، لَا تَدَعُ السَّمَاءُ مِنْ قَطْرٍ اِلَّا صَبَّتْهُ مِدْرَارًا وَلَا تَدَعُ الْاَرْضُ مِنْ نَبَاتِهَا وَبَرَكَاتِهَا شَيْئًا اِلَّا اَخْرَجَتْهُ))

[بحوالہ ''تجدید واحیائے دین'' از مولانا مودودی مرحوم]

''تمہارے دین کی ابتداء نبوت ورحمت ہے' اور وہ تمہارے مابین رہے گی جب تک اللہ چاہے گا' پھر اللہ جل جلالہ اس کو اٹھالے گا' پھر نبوت کے طریقہ پر خلافت ہوگی جب تک اللہ چاہے گا' پھر اللہ اس کو بھی اٹھالے گا۔ پھر بداطوار بادشاہی ہوگی اور جب تک اللہ چاہے گا رہے گی' پھر اللہ اسے بھی اٹھالے گا' پھر جبر کی فرماں روائی ہوگی اور وہ بھی جب تک اللہ چاہے گا رہے گی' پھر اللہ اسے بھی اٹھالے گا۔ پھر وہی نبوت کے طرز پر خلافت ہوگی جو لوگوں میں نبی کی سنت کے

مطابق رہے گی، اور اسلام زمین پر اپنے پاؤں جمائے گا۔ اس حکومت سے آسمان والے بھی اور زمین والے بھی خوش ہوں گے۔ آسمان دل کھول کر اپنی برکتوں کی بارش برسائے گا اور زمین اپنے پیٹ کے سارے خزانے اگل دے گی''۔

علاماتِ قیامت

عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ ﷛ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((بُعِثْتُ اَنَا وَالسَّاعَةُ كَهَاتَيْنِ)) وَضَمَّ السَّبَّابَةَ وَالْوُسْطٰى۔ [صحیح البخاری، کتاب الرقاق، باب قول النبی ﷺ بعثت انا و الساعۃ کھاتین۔ وصحیح مسلم، کتاب الفتن و اشراط الساعۃ، باب قرب الساعۃ]

حضرت انس بن مالک ﷛ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''میں اور قیامت اس طرح بھیجے گئے ہیں''۔ راوی بیان کرتے ہیں کہ یہ فرماتے ہوئے آپ ﷺ نے انگشت شہادت اور درمیانی انگلی کو باہم ملایا۔

عَنِ الْمُسْتَوْرِدِ بْنِ شَدَّادٍ ﷛ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((بُعِثْتُ فِيْ نَفْسِ السَّاعَةِ، فَسَبَقْتُهَا كَمَا سَبَقَتْ هٰذِهٖ هٰذِهٖ)) لِاُصْبُعَيْهِ السَّبَّابَةِ وَالْوُسْطٰى

[سنن الترمذی، ابواب الفتن، باب ما جاء فی قول النبی ﷺ بعثت انا و الساعۃ کھاتین]

مستورد بن شداد ﷛ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''میں بالکل قیامت کے زمانہ میں بھیجا گیا ہوں، میری قیامت سے اسی قدر سبقت ہے جیسی اس انگلی کی اس پر (یعنی بیچ کی انگلی کی شہادت کی انگلی پر)۔''

عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ ﷛ قَالَ: بَيْنَمَا نَحْنُ جُلُوْسٌ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ ذَاتَ يَوْمٍ، اِذْ طَلَعَ عَلَيْنَا رَجُلٌ...... قَالَ: فَاَخْبِرْنِيْ عَنِ السَّاعَةِ، قَالَ: ((مَا الْمَسْئُوْلُ عَنْهَا بِاَعْلَمَ مِنَ السَّائِلِ)) قَالَ: فَاَخْبِرْنِيْ عَنْ اَمَارَاتِهَا، قَالَ: ((اَنْ تَلِدَ الْاَمَةُ رَبَّتَهَا، وَاَنْ تَرَى الْحُفَاةَ الْعُرَاةَ الْعَالَةَ رِعَاءَ الشَّاءِ يَتَطَاوَلُوْنَ فِي الْبُنْيَانِ))

[صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان الایمان و الاسلام و الاحسان]

''حضرت عمر بن الخطاب ﷛ سے روایت ہے کہ ایک روز ہم رسول اللہ ﷺ کے پاس بیٹھے

ہوئے تھے۔ اس دوران ہمارے پاس ایک شخص نمودار ہوا...... وہ کہنے لگا: مجھے قیامت کے بارے میں بتائیں کہ کب ہوگی! آپؐ نے فرمایا: ''جس سے پوچھا جا رہا ہے وہ پوچھنے والے سے زیادہ نہیں جانتا۔'' وہ کہنے لگا: مجھے اس کی علامات بتا دیں! آپؐ نے فرمایا: ''جب لونڈی اپنی مالکہ کو جنم دے گی اور جب تم دیکھو کہ ننگے پاؤں' ننگے بدن محتاج' بکریوں کو چرانے والے اونچی اونچی عمارتیں بنانے میں ایک دوسرے سے مقابلہ کریں گے۔''

عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ رضی اللہ عنہ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: ((لَا تَقُوْمُ السَّاعَۃُ حَتّٰی یَکْثُرَ الْمَالُ وَیَفِیْضَ، حَتّٰی یَخْرُجَ الرَّجُلُ بِزَکَاۃِ مَالِہٖ فَلَا یَجِدُ اَحَدًا یَقْبَلُھَا مِنْہُ، وَحَتّٰی تَعُوْدَ اَرْضُ الْعَرَبِ مُرُوْجًا وَاَنْھَارًا))

[صحیح مسلم' کتاب الزکاۃ' باب الترغیب فی الصدقۃ قبل ان لا یوجد من یقبلھا]

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''قیامت نہ آئے گی یہاں تک کہ مال کی اس قدر کثرت اور فراوانی ہو جائے کہ آدمی اپنے مال کی زکوٰۃ لے کر نکلے تو کوئی وصول کرنے والا (زکوٰۃ کا حق دار) نہ پائے' اور یہاں تک کہ عرب کی زمین چراگاہوں اور نہروں میں تبدیل ہو جائے۔''

عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم: ((لَا تَقُوْمُ السَّاعَۃُ حَتّٰی یَحْسِرَ الْفُرَاتُ عَنْ جَبَلٍ مِنْ ذَھَبٍ یَقْتَتِلُ النَّاسُ عَلَیْہِ، فَیُقْتَلُ مِنْ کُلِّ مِائَۃٍ تِسْعَۃٌ وَتِسْعُوْنَ، وَیَقُوْلُ کُلُّ رَجُلٍ مِنْھُمْ لَعَلِّیْ اَکُوْنُ اَنَا الَّذِیْ اَنْجُوْ)) [صحیح مسلم' کتاب الفتن واشراط الساعۃ' باب لا تقوم الساعۃ حتی یحسر الفرات عن جبل من ذھب]

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''قیامت اُس وقت تک قائم نہ ہو گی جب تک فرات سے سونے کا پہاڑ نہ نکلے گا۔ لوگ اس کے لیے لڑیں گے تو ہر سینکڑے میں سے ننانوے مارے جائیں گے' اور اُن میں سے ہر شخص (اپنے دل میں) کہے گا: کاش میں بچ جاؤں (اور اس سونے کو حاصل کر لوں!)''

عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ رضی اللہ عنہ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: ((لَا تَقُوْمُ السَّاعَۃُ حَتّٰی یَنْزِلَ فِیْکُمْ ابْنُ مَرْیَمَ حَکَمًا مُقْسِطًا فَیَکْسِرَ الصَّلِیْبَ وَیَقْتُلَ الْخِنْزِیْرَ وَیَضَعَ الْجِزْیَۃَ وَیَفِیْضَ الْمَالُ

حَتّٰى لَا يَقْبَلَهٗ اَحَدٌ)) [صحیح البخاری، کتاب المظالم والغصب، باب کسر الصلیب وقتل الخنزیر]

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''قیامت قائم نہ ہوگی یہاں تک کہ تم میں (حضرت عیسیٰؑ) ابن مریمؑ انصاف کرنے والے حاکم کے طور پر اتریں، پس وہ صلیب کو توڑ دیں گے، خنزیر کو قتل کر دیں گے، جزیہ موقوف کر دیں گے، اور مال کی فراوانی ہو جائے گی، یہاں تک کہ اس کو کوئی قبول کرنے والا نہ ہوگا۔''

عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم: ((لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰى تَطْلُعَ الشَّمْسُ مِنْ مَغْرِبِهَا، فَاِذَا رَآهَا النَّاسُ آمَنَ مَنْ عَلَيْهَا، فَذَاكَ حِيْنَ ﴿لَا يَنْفَعُ نَفْسًا اِيْمَانُهَا لَمْ تَكُنْ اٰمَنَتْ مِنْ قَبْلُ﴾)) [صحیح البخاری، کتاب تفسیر القرآن، باب لا ینفع نفسا ایمانها۔ وصحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان الزمن الذی لا یقبل فیه الایمان]

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''قیامت قائم نہ ہوگی جب تک سورج مغرب سے طلوع نہیں ہوگا۔ پس جب لوگ اس کو دیکھ لیں گے تو اس زمین پر رہنے والے ایمان لے آئیں گے۔ پس یہی وقت ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''اُس وقت کسی جان کا ایمان لانا فائدہ مند نہ ہوگا جو پہلے ایمان نہیں لائی ہوگی''۔

عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم: ((لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰى تَخْرُجَ نَارٌ مِنْ اَرْضِ الْحِجَازِ تُضِيْءُ اَعْنَاقَ الْاِبِلِ بِبُصْرٰى)) [صحیح البخاری، کتاب الفتن، باب خروج النار۔ وصحیح مسلم، کتاب الفتن واشراط الساعة، باب لا تقوم الساعة حتی تخرج نار من ارض الحجاز]

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''قیامت اُس وقت تک قائم نہ ہوگی جب تک کہ حجاز سے نکلنے والی آگ بصریٰ (عراق کا ایک شہر) میں اونٹوں کی گردنوں کو روشن نہ کر دے''۔

عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رضی اللہ عنہ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: ((اَمَّا اَوَّلُ اَشْرَاطِ السَّاعَةِ نَارٌ تَحْشُرُ النَّاسَ مِنَ الْمَشْرِقِ اِلَى الْمَغْرِبِ))

[صحیح البخاری، کتاب احادیث الانبیاء، باب خلق آدم و ذریته]

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''قیامت کی نشانیوں میں پہلی نشانی آگ ہے جو (مشرق سے اٹھے گی اور) لوگوں کو سمیٹ کر مشرق سے مغرب کو لے آئے گی''۔

عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ رضی اللہ عنہ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: ((بَادِرُوْا بِالْاَعْمَالِ سِتًّا: طُلُوْعَ الشَّمْسِ مِنْ مَغْرِبِھَا، اَوِ الدُّخَانَ، اَوِ الدَّجَّالَ، اَوِ الدَّابَّۃَ، اَوْخَاصَّۃَ اَحَدِکُمْ، اَوْ اَمْرَ الْعَامَّۃِ))

[صحیح مسلم، کتاب الفتن و اشراط الساعۃ، باب فی بقیۃ من احادیث الدجال]

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''چھ چیزوں کا ظہور ہونے سے پہلے نیک اعمال کرنے میں جلدی کرو: سورج کا مغرب سے نکلنا، دھواں، دجال، جانور کا نکلنا، موت اور قیامت''۔

عَنْ عَوْفِ بْنِ مَالِکٍ رضی اللہ عنہ قَالَ: اَتَیْتُ النَّبِیَّ صلی اللہ علیہ وسلم فِیْ غَزْوَۃِ تَبُوْکَ وَھُوَ فِیْ قُبَّۃٍ مِنْ اَدَمٍ، فَقَالَ: ((اعْدُدْ سِتًّا بَیْنَ یَدَیِ السَّاعَۃِ: مَوْتِیْ، ثُمَّ فَتْحُ بَیْتِ الْمَقْدِسِ، ثُمَّ مُوْتَانٌ یَاْخُذُ فِیْکُمْ کَقُعَاصِ الْغَنَمِ، ثُمَّ اسْتِفَاضَۃُ الْمَالِ حَتّٰی یُعْطَی الرَّجُلُ مِائَۃَ دِیْنَارٍ فَیَظَلُّ سَاخِطًا، ثُمَّ فِتْنَۃٌ لَا یَبْقٰی بَیْتٌ مِنَ الْعَرَبِ اِلَّا دَخَلَتْہُ، ثُمَّ ھُدْنَۃٌ تَکُوْنُ بَیْنَکُمْ وَبَیْنَ بَنِی الْاَصْفَرِ، فَیَغْدِرُوْنَ فَیَاْتُوْنَکُمْ تَحْتَ ثَمَانِیْنَ غَایَۃً تَحْتَ کُلِّ غَایَۃٍ اِثْنَا عَشَرَ اَلْفًا))

[صحیح البخاری، کتاب الجزیۃ، باب ما یحذر من الغدر]

حضرت عوف بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں غزوۂ تبوک میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، آپؐ اُس وقت چمڑے کے ایک خیمے میں تشریف فرما تھے۔ مجھ سے فرمایا: ''قیامت سے پہلے چھ چیزیں ہوں گی، ان کو گن رکھو: (۱) میری وفات (۲) پھر بیت المقدس کی فتح (۳) پھر بھیڑ بکریوں کی طرح تم لوگوں میں موت کا پھیلنا (۴) پھر مال کا اس حد تک بڑھ جانا کہ کسی شخص کو سو اشرفیاں دی جائیں گی پھر بھی (حقیر سمجھ کر) وہ ناخوش رہے گا (۵) پھر ایک ایسا فتنہ جو عرب کے ہر گھر میں داخل ہو جائے گا (٦) پھر اہل روم اور تمہارے درمیان صلح کا ہونا، لیکن وہ تم سے دغا کریں گے اور اسّی جھنڈے لے کر تم سے لڑنے آئیں گے، ہر

جھنڈے کے نیچے بارہ بارہ ہزار آدمی ہوں گے''۔

عَنْ حُذَیْفَةَ بْنِ اَسِیْدٍ الْغِفَارِیِّ رضی اللہ عنہ قَالَ: اِطَّلَعَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم عَلَیْنَا وَنَحْنُ نَتَذَاکَرُ، فَقَالَ: ((مَا تَذَاکَرُوْنَ؟)) قَالُوْا: نَذْکُرُ السَّاعَةَ، قَالَ: ((اِنَّھَا لَنْ تَقُوْمَ حَتّٰی تَرَوْنَ قَبْلَھَا عَشْرَ آیَاتٍ)) فَذَکَرَ الدُّخَانَ، وَالدَّجَّالَ، وَالدَّابَّةَ، وَطُلُوْعَ الشَّمْسِ مِنْ مَغْرِبِھَا، وَنُزُوْلَ عِیْسَی بْنِ مَرْیَمَ علیہ السلام، وَیَاْجُوْجَ وَمَاْجُوْجَ، وَثَلَاثَةَ خُسُوْفٍ: خَسْفٌ بِالْمَشْرِقِ، وَخَسْفٌ بِالْمَغْرِبِ، وَخَسْفٌ بِجَزِیْرَةِ الْعَرَبِ، وَآخِرُ ذٰلِکَ نَارٌ تَخْرُجُ مِنَ الْیُمَنِ تَطْرُدُ النَّاسَ اِلٰی مَحْشَرِھِمْ)) [صحیح مسلم، کتاب الفتن واشراط الساعة، باب فی الآیات التی تکون قبل الساعة۔ وسنن ابی داوٗد، کتاب الملاحم، باب امارات الساعة]

حضرت حذیفہ بن اسید الغفاری رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ ہم باہم باتیں کر رہے تھے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس اچانک آ گئے، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: ''کس بات کا تذکرہ ہو رہا ہے؟'' ہم کہنے لگے: قیامت کا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''قیامت ہرگز قائم نہ ہو گی جب تک اس سے پہلے تم دس نشانیاں نہ دیکھ لو''۔ چنانچہ آپؐ نے دھوئیں، دجال، جانور کے نکلنے، سورج کے مغرب سے طلوع ہونے، عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کی دوبارہ آمد، یاجوج و ماجوج کے نکلنے اور زمین کے تین جگہ سے دھنس جانے کا ذکر فرمایا، یعنی مشرق میں، مغرب میں اور جزیرہ نمائے عرب میں، اور ان سب کے بعد یمن سے آگ کے نکلنے کا ذکر فرمایا جو لوگوں کو محشر کی طرف ہانکے گی''۔

عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِکٍ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم: ((لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰی یَتَقَارَبَ الزَّمَانُ، فَتَکُوْنُ السَّنَةُ کَالشَّھْرِ، وَالشَّھْرُ کَالْجُمُعَةِ، وَتَکُوْنُ الْجُمُعَةُ کَالْیَوْمِ، وَیَکُوْنُ الْیَوْمُ کَالسَّاعَةِ، وَتَکُوْنُ السَّاعَةُ کَالضَّرَمَةِ بِالنَّارِ))

[سنن الترمذی، ابواب الزھد، باب ما جاء فی تقارب الزمان وقصر الامل]

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''قیامت اُس وقت تک قائم نہ ہو گی جب تک زمانہ قریب قریب نہ ہو جائے، یعنی سال مہینے کے مانند، مہینہ جمعہ

(ایک ہفتہ) کے مانند‘ جمعہ (ایک ہفتہ) ایک دن کی طرح اور دن گھنٹے کی طرح ہو جائے گا‘ جبکہ گھنٹے کی حیثیت محض آگ کی چنگاری کی ہوگی‘‘۔

عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رضی اللہ عنہ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: ((لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ عَلٰى اَحَدٍ يَقُوْلُ: اللّٰهُ اللّٰهُ)) وَفِيْ رِوَايَةٍ: ((حَتّٰى لَا يُقَالَ فِي الْاَرْضِ: اللّٰهُ اللّٰهُ)) [صحیح مسلم‘ کتاب الایمان‘ باب ذهاب الایمان آخر الزمان۔ و سنن الترمذی‘ ابواب الفتن]

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ’’قیامت قائم نہ ہوگی کسی ایک شخص پر بھی جو ’اللہ اللہ‘ کہتا ہوگا‘‘۔ اور دوسری روایت میں یہ ہے کہ: ’’قیامت قائم نہ ہوگی جب تک زمین میں ’اللہ اللہ‘ کہا جاتا ہے‘‘۔

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم: ((لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ اِلَّا عَلٰى شِرَارِ النَّاسِ)) [صحیح مسلم‘ کتاب الفتن و اشراط الساعة‘ باب قرب الساعة]

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ’’قیامت صرف شریر لوگوں پر آئے گی‘‘۔

عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم: ((اِنَّ اللّٰهَ يَبْعَثُ رِيْحًا مِنَ الْيَمَنِ اَلْيَنَ مِنَ الْحَرِيْرِ فَلَا تَدَعُ اَحَدًا فِيْ قَلْبِهٖ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِنْ اِيْمَانٍ اِلَّا قَبَضَتْهُ)) وَفِيْ رِوَايَةٍ: ((مِثْقَالَ ذَرَّةٍ))

[صحیح مسلم‘ کتاب الایمان‘ باب فی الریح التی تکون قرب القیامة......]

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ’’اللہ تعالیٰ قیامت کے قریب یمن سے ریشم سے بھی زیادہ نرم ہوا چلائے گا‘ پس وہ ہر اُس آدمی کو ختم کر دے گی جس کے دل میں دانے کے برابر بھی ایمان ہوگا‘‘۔ اور ایک دوسری روایت میں ’’رتی برابر‘‘ کے الفاظ ہیں۔

قربِ قیامت کی ہولناک جنگیں

عَنْ اُبَيِّ بْنِ كَعْبٍ رضی اللہ عنہ قَالَ: اِنِّيْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم يَقُوْلُ: ((يُوْشِكُ الْفُرَاتُ اَنْ يَحْسِرَ عَنْ جَبَلٍ مِنْ ذَهَبٍ، فَاِذَا سَمِعَ بِهِ النَّاسُ سَارُوْا اِلَيْهِ، فَيَقُوْلُ مَنْ عِنْدَهٗ: لَئِنْ

تَرَکْنَا النَّاسَ یَأْخُذُوْنَ مِنْہُ لَیُذْھِبَنَّ بِہٖ کُلِّہٖ، قَالَ: فَیَقْتَتِلُوْنَ عَلَیْہِ فَیُقْتَلُ مِنْ کُلِّ مِائَۃٍ تِسْعَۃٌ وَتِسْعُوْنَ)) [صحیح مسلم' کتاب الفتن واشراط الساعۃ' باب لا تقوم الساعۃ حتی یحسر الفرات......]

حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا: ''قریب ہے کہ فرات میں سونے کا ایک پہاڑ نمودار ہو۔ جب لوگ یہ سنیں گے تو اس کی طرف لپکیں گے۔ پس جو لوگ وہاں موجود ہوں گے وہ کہیں گے کہ اگر ہم لوگوں کو اس میں سے لینے کی اجازت دے دیں تو وہ لازماً سارا پہاڑ لے جائیں گے''۔ آپؐ نے یہ بھی فرمایا کہ ''پھر لوگ اس پر لڑیں گے تو ہر سو میں سے ننانوے لوگ مارے جائیں گے''۔

عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم: ((لَا تَقُوْمُ السَّاعَۃُ حَتّٰی یُقَاتِلَ الْمُسْلِمُوْنَ الْیَھُوْدَ، فَیَقْتُلُھُمُ الْمُسْلِمُوْنَ حَتّٰی یَخْتَبِئَ الْیَھُوْدِیُّ مِنْ وَرَاءِ الْحَجَرِ وَالشَّجَرِ، فَیَقُوْلُ الْحَجَرُ اَوِ الشَّجَرُ: یَا مُسْلِمُ' یَا عَبْدَ اللّٰہِ' ھٰذَا یَھُوْدِیٌّ خَلْفِیْ، فَتَعَالَ فَاقْتُلْہُ، اِلَّا الْغَرْقَدَ فَاِنَّہٗ مِنْ شَجَرِ الْیَھُوْدِ)) [صحیح مسلم' کتاب الفتن واشراط الساعۃ' باب لا تقوم الساعۃ حتی یمر الرجل بقبر الرجل فیتمنی......]

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''قیامت قائم نہ ہو گی یہاں تک کہ مسلمان یہود سے لڑیں گے' پس مسلمان ان کو قتل کریں گے' یہاں تک کہ یہودی کسی پتھر یا درخت کی آڑ میں چھپے گا تو وہ پتھر یا درخت بولے گا اے مسلمان! اے اللہ کے بندے! یہ میرے پیچھے ایک یہودی ہے' ادھر آؤ اور اس کو قتل کرو' مگر غرقد کا درخت نہ بولے گا' (یہ ایک کانٹے دار درخت ہے جو بیت المقدس کی طرف بہت زیادہ ہوتا ہے) کیونکہ وہ یہود کا درخت ہے''۔

عَنْ ذِیْ مِخْبَرٍ رضی اللہ عنہ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم یَقُوْلُ: ((سَتُصَالِحُوْنَ الرُّوْمَ صُلْحًا آمِنًا، فَتَغْزُوْنَ اَنْتُمْ وَھُمْ عَدُوًّا مِنْ وَرَائِکُمْ، فَتُنْصَرُوْنَ وَتَغْنَمُوْنَ وَتَسْلَمُوْنَ' ثُمَّ تَرْجِعُوْنَ حَتّٰی تَنْزِلُوْا بِمَرْجٍ ذِیْ تُلُوْلٍ، فَیَرْفَعُ رَجُلٌ مِنْ اَھْلِ النَّصْرَانِیَّۃِ الصَّلِیْبَ فَیَقُوْلُ: غَلَبَ الصَّلِیْبُ، فَیَغْضَبُ رَجُلٌ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ فَیَدُقُّہٗ، فَعِنْدَ ذٰلِکَ تَغْدِرُ

الرُّوْمُ وَتَجْمَعُ لِلْمَلْحَمَةِ)) زَادَ فِیْ رِوَایَةٍ:((وَیَثُوْرُ الْمُسْلِمُوْنَ اِلٰی اَسْلِحَتِهِمْ فَیَقْتَتِلُوْنَ، فَیُکْرِمُ اللّٰهُ تِلْكَ الْعِصَابَةَ بِالشَّهَادَةِ))

[سنن ابی داؤد، کتاب الملاحم، باب ما یذکر من ملاحم الروم۔ وسنن ابن ماجه، کتاب الفتن، باب الملاحم]

حضرت ذی مخبر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا: ''عنقریب تم اہل روم سے امن و آشتی کے ساتھ صلح کرو گے، پھر تم اور وہ مل کر ایک اور دشمن سے لڑو گے۔ اس جنگ میں تمہیں فتح ہوگی، تمہیں مالِ غنیمت نصیب ہوگا اور پھر تم سلامتی سے لوٹ آؤ گے، یہاں تک کہ تم ایک ٹیلے والے میدان میں اُترو گے۔ اس دوران عیسائیوں میں سے ایک آدمی اٹھے گا جو صلیب کو بلند کر کے کہے گا: صلیب جیت گئی! اس پر مسلمانوں میں سے ایک آدمی کو غصہ آئے گا تو وہ اس صلیب کو توڑ ڈالے گا۔ اس پر روم والے معاہدہ توڑ دیں گے اور لوگوں کو لڑائی کے لیے جمع کریں گے''۔ ایک روایت میں یہ اضافہ ہے: ''مسلمان پھر جلدی سے اپنے ہتھیاروں کی طرف جائیں گے اور لڑیں گے، تو اللہ تعالیٰ اس جماعت کو شہادت کا اعزاز عطا فرمائے گا''۔

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ النَّبِیُّ ﷺ:((یُوْشِكُ الْمُسْلِمُوْنَ اَنْ یُحَاصَرُوْا اِلَی الْمَدِیْنَةِ حَتّٰی یَکُوْنَ اَبْعَدَ مَسَالِحِهِمْ سَلَاحِ))...... وعن الزهری سلاح قریب من خیبر......

[سنن ابی داؤد، کتاب الفتن والملاحم، باب ذکر الفتن ودلائلها]

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ''قریب ہے کہ مسلمان مدینہ منورہ میں گھیر لیے جائیں گے یہاں تک کہ ان کی سب سے دُور کی سرحد ''سلاح'' ہوگی۔ زہریؒ سے منقول ہے کہ ''سلاح'' خیبر سے قریب ہے۔

عَنْ ثَوْبَانَ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ:((یَقْتَتِلُ عِنْدَ کَنْزِکُمْ ثَلَاثَةٌ، کُلُّهُمْ ابْنُ خَلِیْفَةٍ، ثُمَّ لَا یَصِیْرُ اِلٰی وَاحِدٍ مِنْهُمْ، ثُمَّ تَطْلُعُ الرَّاٰیَاتُ السُّوْدُ مِنْ قِبَلِ الْمَشْرِقِ فَیَقْتُلُوْنَکُمْ قَتْلًا لَمْ یُقْتَلْهُ قَوْمٌ))۔ ثُمَّ ذَکَرَ شَیْئًا لَا اَحْفَظُهٗ فَقَالَ:((فَاِذَا رَاَیْتُمُوْهُ

فَبَايِعُوْهُ وَلَوْ حَبْوًا عَلَى الثَّلْجِ فَإِنَّهٗ خَلِيْفَةُ اللّٰهِ الْمَهْدِيُّ))

[سنن ابن ماجه، کتاب الفتن، باب خروج المهدی]

حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تمہارے ایک خزانے کے پاس تین سردار مارے جائیں گے، ان میں سے ہر ایک خلیفہ (حاکم) کا بیٹا ہوگا، اس کے باوجود وہ خزانہ کسی کو نہ ملے گا۔ پھر مشرق کی جانب سے سیاہ جھنڈے نمودار ہوں گے، اور وہ تم کو اس انداز سے قتل کریں گے (یعنی عربوں کو جو اُس وقت وہ خزانہ لینا چاہیں گے) جیسا کسی قوم کو قتل نہیں کیا گیا''۔ پھر آپؐ نے کچھ اور بیان کیا جو مجھ کو یاد نہیں۔ پھر آپؐ نے فرمایا: ''(پھر اللہ کا خلیفہ مہدی آئے گا) جب تم اس کو دیکھو تو اس سے بیعت کرو اگرچہ ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل برف پر چل کر، کیونکہ وہ اللہ کا خلیفہ مہدی ہے''۔

عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم: ((إِذَا وَقَعَتِ الْمَلَاحِمُ بَعَثَ اللّٰهُ بَعْثًا مِنَ الْمَوَالِیْ هُمْ اَكْرَمُ الْعَرَبِ فَرَسًا وَاَجْوَدُهٗ سِلَاحًا يُؤَيِّدُ اللّٰهُ بِهِمُ الدِّيْنَ))

[سنن ابن ماجه، کتاب الفتن، باب الملاحم]

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب بڑی بڑی لڑائیاں ہوں گی تو اللہ تعالیٰ موالی میں سے (یعنی عرب کے سوا دوسرے مسلمانوں میں سے جن کو عرب نے آزاد کیا ہے، جیسے اہل فارس، ترک وغیرہ) ایک لشکر اٹھائے گا، وہ سارے عرب سے زیادہ اچھی گھڑ سواری کرتے ہوں گے اور ان سے بہتر ہتھیار رکھتے ہوں گے، اللہ تعالیٰ ان کے ذریعے دین کی مدد کرے گا''۔

عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم: ((تَخْرُجُ مِنْ خُرَاسَانَ رَاْيَاتٌ سُوْدٌ لَا يَرُدُّهَا شَیْئٌ حَتّٰی تُنْصَبَ بِاِيْلِيَاءَ))

[سنن الترمذی، ابواب الفتن، باب ما جاء فی النهی عن سب الرياح]

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''خراسان سے سیاہ جھنڈے نکلیں گے، جنہیں کوئی نہیں روک سکے گا، یہاں تک کہ وہ ایلیاء (بیت المقدس) میں نصب کر دیے جائیں گے''۔

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ الْحَارِثِ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم: ((يَخْرُجُ نَاسٌ مِنَ الْمَشْرِقِ

فَيُوَطِّئُوْنَ لِلْمَهْدِيِّ يَعْنِيْ سُلْطَانَهٗ))

[سنن ابن ماجه، کتاب الفتن، باب خروج المهدی]

حضرت عبداللہ بن حارث رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کچھ لوگ مشرق سے نکلیں گے، وہ لوگ گویا مہدی کی سلطنت جما دیں گے''۔

حضرت مہدی کی شخصیت

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم: ((لَا تَذْهَبُ الدُّنْيَا حَتّٰى يَمْلِكَ الْعَرَبَ رَجُلٌ مِنْ اَهْلِ بَيْتِيْ يُوَاطِئُ اسْمُهٗ اسْمِيْ)) رواه الترمذی، وابوداؤد وفی روایة لهٗ: **قَالَ: ((لَوْ لَمْ يَبْقَ مِنَ الدُّنْيَا اِلَّا يَوْمٌ لَطَوَّلَ اللّٰهُ ذٰلِكَ الْيَوْمَ حَتّٰى يَبْعَثَ اللّٰهُ فِيْهِ رَجُلًا مِّنِّيْ —— اَوْمِنْ اَهْلِ بَيْتِيْ —— يُوَاطِئُ اسْمُهٗ اسْمِيْ وَاسْمُ اَبِيْهِ اسْمُ اَبِيْ، يَمْلَأُ الْاَرْضَ قِسْطًا وَعَدْلًا، كَمَا مُلِئَتْ ظُلْمًا وَجَوْرًا))** [سنن الترمذی، ابواب الفتن، باب ما جاء فی المهدی۔ وسنن ابی داؤد، کتاب المهدی]

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''دنیا ختم نہ ہو گی جب تک میرے اہل بیت میں سے ایک شخص عرب کا بادشاہ نہ ہو، اس کا نام میرے نام جیسا ہو گا''۔ یہ ترمذی اور ابوداؤد میں ہے اور ایک دوسری روایت میں ہے: ''اگر دنیا کے خاتمے کا ایک دن باقی رہ جائے تو اللہ تعالیٰ اس کو طویل کر دے گا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اس میں اس آدمی کو بھیج دے گا جو مجھ سے (یا میرے اہل بیت میں سے) ہو گا، جس کا نام میرے نام جیسا ہوگا اور اس کے والد کا نام میرے والد ماجد کا نام ہو گا۔ وہ زمین کو عدل و انصاف سے بھر دے گا، جیسا کہ اس سے پہلے زمین ظلم و زیادتی سے بھری ہو گی''۔

عَنْ اُمِّ سَلَمَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا قَالَتْ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم يَقُوْلُ: ((اَلْمَهْدِيُّ مِنْ عِتْرَتِيْ مِنْ وَلَدِ فَاطِمَةَ)) [سنن ابی داؤد، کتاب المهدی]

حضرت اُم سلمہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا: ''مہدی میری نسل سے، حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی اولاد میں سے ہوں گے''۔

عَنْ اَبِی سَعِیْدٍ الْخُدْرِیِّ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم: ((اَلْمَھْدِیُّ مِنِّیْ، اَجْلَی الْجَبْھَۃِ، اَقْنَی الْاَنْفِ، یَمْلَأُ الْاَرْضَ قِسْطًا وَعَدْلًا، کَمَا مُلِئَتْ ظُلْمًا وَجَوْرًا، یَمْلِكُ سَبْعَ سِنِیْنَ)) [سنن ابی داوٗد' کتاب المهدی]

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مہدی میری اولاد میں سے ہوں گے' کشادہ پیشانی والے' اونچی ناک والے' جو زمین کو عدل وانصاف سے بھر دیں گے' جیسے وہ ظلم وستم سے بھری ہوئی تھی' اور وہ سات برس تک بادشاہ رہیں گے''۔

نزولِ عیسیٰؑ اور فتنۂ دجال

عَنْ اَبِی ھُرَیْرَۃَ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم: ((وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ لَیُوْشِکَنَّ اَنْ یَنْزِلَ فِیْکُمُ ابْنُ مَرْیَمَ، حَکَمًا عَدْلًا، فَیَکْسِرَ الصَّلِیْبَ، وَیَقْتُلَ الْخِنْزِیْرَ، وَیَضَعَ الْجِزْیَۃَ، وَیَفِیْضَ الْمَالُ حَتّٰی لَا یَقْبَلَہٗ اَحَدٌ، حَتّٰی تَکُوْنَ السَّجْدَۃُ الْوَاحِدَۃُ خَیْرًا مِنَ الدُّنْیَا وَمَا فِیْھَا)) [صحیح البخاری' کتاب احادیث الانبیاء' باب نزول عیسٰی بن مریم۔ وصحیح مسلم' کتاب الایمان' باب نزول عیسی بن مریم......]

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اُس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے' وہ زمانہ قریب ہے کہ ابن مریم (عیسٰی علیہ السلام) تم لوگوں میں حاکم عادل بن کر اُتریں گے۔ صلیب کو توڑ دیں گے' خنزیر کو قتل کریں گے' جزیہ موقوف کر دیں گے' اور مال کی فراوانی ہو جائے گی' یہاں تک کہ کوئی اسے قبول کرنے والا نہیں ہوگا۔ اس وقت ایک سجدہ دنیا و مافیہا سے بہتر ہوگا''۔

عَنْ اَبِی ھُرَیْرَۃَ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم: ((کَیْفَ اَنْتُمْ اِذَا نَزَلَ ابْنُ مَرْیَمَ فِیْکُمْ وَاِمَامُکُمْ مِنْکُمْ)) [صحیح البخاری' کتاب احادیث الانبیاء' باب نزول عیسی ابن مریم۔ وصحیح مسلم' کتاب الایمان' باب نزول عیسٰی بن مریم حاکمًا......]

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''اُس وقت تمہارا کیا حال ہوگا جب ابن مریم (عیسٰیؑ) تم میں اتریں گے' اور تمہارا امام تمہاری قوم میں سے ہوگا!''

عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم: ((لَا تَزَالُ طَائِفَةٌ مِنْ اُمَّتِیْ یُقَاتِلُوْنَ عَلَى الْحَقِّ ظَاهِرِیْنَ اِلٰی یَوْمِ الْقِیَامَةِ، فَیَنْزِلُ عِیْسَی بْنُ مَرْیَمَ علیہ السلام فَیَقُوْلُ اَمِیْرُهُمْ: تَعَالَ صَلِّ لَنَا، فَیَقُوْلُ: لَا، اِنَّ بَعْضَكُمْ عَلٰی بَعْضٍ اُمَرَاءُ، تَكْرِمَةَ اللّٰهِ هٰذِهِ الْاُمَّةَ)) [صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب نزول عیسی بن مریم حاکما......]

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میری اُمت کا ایک گروہ حق پر قیامت کے دن تک لڑتا رہے گا، وہ غالب رہے گا۔ پھر عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام اُتریں گے اور اس گروہ کا امام (حضرت عیسیٰؑ سے) کہے گا: نماز پڑھائیے! وہ فرمائیں گے: نہیں، بے شک تم ایک دوسرے پر حاکم ہو''۔ یہ وہ بزرگی ہے، جو اللہ تعالیٰ اس اُمت کو عنایت کرے گا''۔

عَنْ مُجَمِّعِ بْنِ جَارِیَةَ الْاَنْصَارِیِّ رضی اللہ عنہ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم یَقُوْلُ: ((یَقْتُلُ ابْنُ مَرْیَمَ الدَّجَّالَ بِبَابِ لُدٍّ)) [سنن الترمذی، ابواب الفتن، باب ما جاء فی قتل عیسی ابن مریم الدجال]

حضرت مجمع بن جاریہ الانصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ابن مریم (حضرت عیسیٰؑ) دجال کو بابِ لد پر قتل کریں گے''۔

عَنِ النَّوَّاسِ بْنِ سَمْعَانَ رضی اللہ عنہ قَالَ: ذَكَرَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم الدَّجَّالَ فَقَالَ: ((اِنْ یَخْرُجْ وَاَنَا فِیْكُمْ فَاَنَا حَجِیْجُهٗ دُوْنَكُمْ، وَاِنْ یَخْرُجْ وَلَسْتُ فِیْكُمْ فَامْرُؤٌ حَجِیْجُ نَفْسِهٖ، وَاللّٰهُ خَلِیْفَتِیْ عَلٰی كُلِّ مُسْلِمٍ، فَمَنْ اَدْرَكَهٗ مِنْكُمْ فَلْیَقْرَاْ عَلَیْهِ فَوَاتِحَ سُوْرَةِ الْكَهْفِ فَاِنَّهَا جِوَارُكُمْ مِنْ فِتْنَتِهٖ)) قُلْنَا: وَمَا لَبْثُهٗ فِی الْاَرْضِ؟ قَالَ: ((اَرْبَعُوْنَ یَوْمًا، یَوْمٌ كَسَنَةٍ وَیَوْمٌ كَشَهْرٍ وَیَوْمٌ كَجُمُعَةٍ وَسَائِرُ اَیَّامِهٖ كَاَیَّامِكُمْ)) فَقُلْنَا: یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ هٰذَا الْیَوْمُ الَّذِیْ كَسَنَةٍ اَتَكْفِیْنَا فِیْهِ صَلَاةُ یَوْمٍ وَلَیْلَةٍ؟ قَالَ: ((لَا، اقْدُرُوْا لَهٗ قَدْرَهٗ، ثُمَّ یَنْزِلُ عِیْسَی بْنُ مَرْیَمَ عَلَیْهِ السَّلَامُ عِنْدَ الْمَنَارَةِ الْبَیْضَاءِ شَرْقِیَّ دِمَشْقَ فَیُدْرِكُهٗ عِنْدَ بَابِ لُدٍّ فَیَقْتُلُهٗ))

[سنن ابی داؤد، کتاب الملاحم، باب خروج الدجال]

''حضرت نواس بن سمعان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دجال کا ذکر کیا تو فرمایا: ''اگر وہ میرے زندہ ہوتے ہوئے نکلا تو میں تمہاری طرف سے اُس سے جھگڑا کروں گا اور اگر وہ اُس وقت نکلا جب میں تمہارے درمیان نہ رہا تو ہر شخص خود ہی اُس سے جھگڑا کرے گا اور میرا خلیفہ اللہ ہے ہر مسلمان کے لیے۔ پس جو کوئی تم میں اس کو پائے' وہ سورۃ الکہف کی ابتدائی آیات اس پر پڑھے' کیونکہ یہ آیات اس کے فتنے سے تمہارے لیے بچاؤ کا ذریعہ ہیں۔ ہم نے پوچھا: وہ زمین پر کتنا عرصہ رہے گا؟ آپؐ نے فرمایا: ''چالیس دن۔ اس کا ایک دن ایک سال کی طرح ہوگا' دوسرا دن ایک مہینے کی طرح' تیسرا دن پورے ہفتے کے برابر اور باقی دن تمہارے عام دنوں کے برابر ہی ہوں گے''۔ پھر ہم نے پوچھا: اے اللہ کے رسولؐ! وہ جو سال بھر کا ایک ہی دن ہوگا تو اس میں ہمیں ایک ہی دن رات کی نماز کفایت کرے گی؟ آپؐ نے فرمایا: ''نہیں! تم اس روز اس کی مقدار کا اندازہ کر لینا۔ پھر عیسیٰ ابن مریمؑ دمشق کی مشرقی جانب سے سفید مینار کے پاس اُتریں گے' پس وہ دجال کو باب لدّ کے پاس پائیں گے اور وہاں اس کو قتل کر دیں گے''۔

عَنِ النَّوَّاسِ بْنِ سَمْعَانَ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم ((...... كَذٰلِكَ، اِذْ بَعَثَ اللّٰهُ عِيْسَى بْنَ مَرْيَمَ، فَيَنْزِلُ عِنْدَ الْمَنَارَةِ الْبَيْضَاءِ، شَرْقِيَّ دِمَشْقَ، بَيْنَ مَهْرُوْدَتَيْنِ، وَاضِعًا كَفَّيْهِ عَلٰى اَجْنِحَةِ مَلَكَيْنِ، اِذَا طَأْطَاَ رَاْسَهٗ قَطَرَ وَاِذَا رَفَعَهٗ يَنْحَدِرُ مِنْهُ جُمَانٌ كَاللُّؤْلُؤِ، وَلَا يَحِلُّ لِكَافِرٍ يَجِدُ رِيْحَ نَفْسِهٖ اِلَّا مَاتَ، وَنَفَسُهٗ يَنْتَهِيْ حَيْثُ يَنْتَهِيْ طَرَفُهٗ، فَيَنْطَلِقُ حَتّٰى يُدْرِكَهٗ عِنْدَ بَابِ لُدٍّ فَيَقْتُلُهٗ......))

[سنن ابن ماجه' كتاب الفتن' باب فتنة الدجال و خروج عيسى بن مريم ......]

حضرت نواس بن سمعان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''......لوگ اس حال میں ہوں گے' اتنے میں اللہ تعالیٰ عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کو دوبارہ بھیجے گا' تو وہ سفید مینار کے پاس دمشق کے مشرق میں' دو زرد ہلکے کپڑوں میں اپنے دونوں ہاتھ دو فرشتوں کے بازوؤں پر رکھ کر اتریں گے۔ جب وہ اپنے سر کو جھکائیں گے تو اس میں سے پانی کے قطرے ٹپکیں گے اور جب وہ سر کو اٹھائیں گے تو پانی کے قطرے اس میں سے موتیوں کی طرح گریں گے' اور جو کافر ان کے سانس کا اثر پائے گا تو وہ مرجائے گا' اور ان کے سانس کا اثر وہاں تک جائے گا جہاں ا

ن کی نگاہ پہنچے گی۔ آ خر حضرت عیسیٰؑ چلیں گے' یہاں تک کہ وہ دجال کو بابِ لدّ پر پائیں گے تو اس کو قتل کر دیں گے''۔

عَنْ اَبِیْ اُمَامَۃَ الْبَاھِلِیِّ رضی اللہ عنہ قَالَ: خَطَبَنَا رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم فَکَانَ اَکْثَرُ خُطْبَتِہٖ حَدِیْثًا حَدَّثَنَاہُ عَنِ الدَّجَّالِ، وَحَذَّرَنَاہُ، فَکَانَ مِنْ قَوْلِہٖ اَنْ قَالَ: ((اِنَّہٗ لَمْ تَکُنْ فِتْنَۃٌ فِی الْاَرْضِ مُنْذُ ذَرَأَ اللّٰہُ ذُرِّیَّۃَ آدَمَ اَعْظَمَ مِنْ فِتْنَۃِ الدَّجَّالِ، وَاِنَّ اللّٰہَ لَمْ یَبْعَثْ نَبِیًّا اِلَّا حَذَّرَ اُمَّتَہُ الدَّجَّالَ، وَاَنَا آخِرُ الْاَنْبِیَاءِ وَاَنْتُمْ آخِرُ الْاُمَمِ، وَھُوَ خَارِجٌ فِیْکُمْ لَا مَحَالَۃَ......)) فَقَالَتْ اُمُّ شَرِیْکٍ بِنْتُ اَبِی الْعَکَرِ: یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ فَاَیْنَ الْعَرَبُ یَوْمَئِذٍ؟ قَالَ: ((ھُمْ یَوْمَئِذٍ قَلِیْلٌ، وَجُلُّھُمْ بِبَیْتِ الْمَقْدِسِ، وَاِمَامُھُمْ رَجُلٌ صَالِحٌ، فَبَیْنَمَا اِمَامُھُمْ قَدْ تَقَدَّمَ یُصَلِّیْ بِھِمُ الصُّبْحَ اِذْ نَزَلَ عَلَیْھِمْ عَیْسَی بْنُ مَرْیَمَ الصُّبْحَ، فَرَجَعَ ذٰلِکَ الْاِمَامُ یَنْکُصُ یَمْشِی الْقَھْقَرٰی لِیَتَقَدَّمَ عِیْسٰی یُصَلِّیْ بِالنَّاسِ، فَیَضَعُ عِیْسٰی یَدَہٗ بَیْنَ کَتِفَیْہِ ثُمَّ یَقُوْلُ لَہٗ: تَقَدَّمْ فَصَلِّ فَاِنَّھَا لَکَ اُقِیْمَتْ، فَیُصَلِّیْ بِھِمْ اِمَامُھُمْ، فَاِذَا انْصَرَفَ قَالَ عِیْسٰی عَلَیْہِ السَّلَامُ: اِفْتَحُوا الْبَابَ فَیُفْتَحُ ' وَوَرَائَہُ الدَّجَّالُ مَعَہٗ سَبْعُوْنَ اَلْفَ یَھُوْدِیٍّ کُلُّھُمْ ذُوْسَیْفٍ مُحَلًّی وَسَاجٍ، فَاِذَا نَظَرَ اِلَیْہِ الدَّجَّالُ ذَابَ کَمَا یَذُوْبُ الْمِلْحُ فِی الْمَاءِ، وَیَنْطَلِقُ ھَارِبًا، وَیَقُوْلُ عِیْسٰی عَلَیْہِ السَّلَامُ: اِنَّ لِیْ فِیْکَ ضَرْبَۃً لَنْ تَسْبِقَنِیْ بِھَا، فَیُدْرِکُہٗ عِنْدَ بَابِ اللُّدِّ الشَّرْقِیِّ فَیَقْتُلُہٗ، فَیَھْزِمُ اللّٰہُ الْیَھُوْدَ، فَلَا یَبْقٰی شَیْئٌ مِّمَّا خَلَقَ اللّٰہُ یَتَوَارٰی بِہٖ یَھُوْدِیٌّ اِلَّا اَنْطَقَ اللّٰہُ ذٰلِکَ الشَّیْئَ، لَا حَجَرَ وَلَا شَجَرَ وَلَا حَائِطَ وَلَا دَابَّۃَ اِلَّا الْغَرْقَدَۃَ فَاِنَّھَا مِنْ شَجَرِھِمْ، لَا تَنْطِقُ اِلَّا قَالَ: یَا عَبْدَ اللّٰہِ الْمُسْلِمَ ھٰذَا یَھُوْدِیٌّ فَتَعَالَ اقْتُلْہُ))

[سنن ابن ماجه' کتاب الفتن' باب فتنة الدجال وخروج عيسى بن مريم......]

حضرت ابوامامہ الباہلی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے سامنے خطبہ ارشاد فرمایا۔ آپ کا خطبہ زیادہ تر دجال سے متعلق تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دجال کا حال ہم سے بیان کیا اور ہم کو اس سے ڈرایا۔ فرمایا: ''زمین میں کوئی فتنہ' جب سے اللہ تعالیٰ نے آدم کی اولاد کو پیدا کیا' دجال کے فتنے سے بڑھ کر نہیں ہوا۔ اور اللہ تعالیٰ نے کوئی نبی ایسا نہیں بھیجا جس نے اپنی

اُمت کو دجال سے نہ ڈرایا ہو۔ اور میں تمام انبیاء کے آخر میں ہوں اور تم سب اُمتوں سے آخر میں ہو اور دجال تمہی لوگوں میں ضرور پیدا ہوگا۔ اُم شریک بنت ابی عکر نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! عرب لوگ اُس دن کہاں ہوں گے؟ آپؐ نے فرمایا: عرب کے لوگ (مؤمنین) اُس دن کم ہوں گے ۔ ان عرب مؤمنین میں سے اکثر لوگ (اس وقت) بیت المقدس میں ہوں گے۔ ان کا امام ایک نیک شخص ہوگا۔ ایک روز ان کا امام آگے بڑھ کر صبح کی نماز پڑھانا چاہے گا' اتنے میں حضرت عیسیٰ ابن مریمؑ صبح کے وقت اتریں گے تو یہ ان کو دیکھ کر الٹے پاؤں پیچھے ہٹے گا تاکہ حضرت عیسیٰؑ آگے ہو کر نماز پڑھائیں' لیکن حضرت عیسیٰؑ اپنا ہاتھ اس کے دونوں مونڈھوں کے درمیان رکھ دیں گے' پھر اس سے کہیں گے: آپ ہی آگے بڑھیں اور نماز پڑھائیں! اس لیے کہ یہ نماز آپ ہی کے لیے قائم ہوئی تھی۔ پس وہ امام لوگوں کو نماز پڑھائے گا۔ جب وہ نماز سے فارغ ہوگا تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام لوگوں (مسلمانوں) سے فرمائیں گے: دروازہ (قلعہ یا شہر کا دروازہ جس میں وہ لوگ محصور ہوں گے اور دجال اُن کو گھیرے ہوگا) کھول دو! چنانچہ دروازہ کھول دیا جائے گا۔ وہاں پر دجال ہوگا' ستر ہزار یہودیوں کے ساتھ' جن میں سے ہر ایک کے پاس زیور سے آراستہ تلوار اور چادر ہوگی۔ جب دجال حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو دیکھے گا تو ایسا پگھل جائے گا جیسے نمک پانی میں گھل جاتا ہے' اور راہِ فرار اختیار کرے گا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرمائیں گے: میری ایک مار تجھ کو کھانا ہے' تو اس سے بچ نہ سکے گا۔ آخر بابِ لدّ کے پاس' جو مشرق کی طرف ہے' اس کو پائیں گے اور اس کو قتل کریں گے۔ پھر اللہ تعالیٰ یہودیوں کو شکست دے گا۔ یہودی اللہ کی پیدا کی ہوئی چیزوں میں سے جس چیز کی آڑ میں چھپے گا اس چیز کو اللہ تعالیٰ بولنے کی طاقت دے گا' پتھر ہو یا درخت یا دیوار یا جانور' سوائے ایک درخت کے جس کو غرقد کہتے ہیں۔ وہ یہودیوں کا درخت ہے' وہ نہیں بولے گا۔ باقی ہر شے یہی کہے گی: اے اللہ کے مسلمان بندے! یہ یہودی ہے' تو آ اور اس کو مار ڈال''۔

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو رضی اللہ عنہما قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((يَنْزِلُ عِيْسَى بْنُ مَرْيَمَ اِلَى الْاَرْضِ، فَيَتَزَوَّجُ، وَيُوْلَدُ لَهٗ، وَيَمْكُثُ خَمْسًا وَاَرْبَعِيْنَ سَنَةً، ثُمَّ يَمُوْتُ، فَيُدْفَنُ مَعِيَ فِيْ قَبْرِيْ، فَاَقُوْمُ اَنَا وَعِيْسَى بْنُ مَرْيَمَ فِيْ قَبْرٍ وَاحِدٍ بَيْنَ اَبِيْ بَكْرٍ وَعُمَرَ))۔ [رواہ ابن الجوزی فی "کتاب الوفاء"]

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''عیسیٰ بن مریم علیہ السلام زمین پر اتریں گے' شادی کریں گے' ان کے بچے ہوں گے' پینتالیس سال تک رہیں گے' پھر ان پر موت طاری ہوگی اور انہیں میرے ساتھ میری قبر میں دفن کیا جائے گا۔ پس میں اور عیسیٰ بن مریم علیہ السلام دونوں ایک ہی قبر سے ابوبکر اور عمر (رضی اللہ عنہما) کے درمیان اٹھائے جائیں گے''۔

نہی عن المنکر کی اہمیت

عَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ الْخُدْرِیِّ رضی اللہ عنہ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: ((مَنْ رَاٰی مِنْکُمْ مُنْکَرًا فَلْیُغَیِّرْہُ بِیَدِہٖ، فَاِنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِہٖ، فَاِنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِہٖ، وَذٰلِکَ اَضْعَفُ الْاِیْمَانِ))۔

[صحیح مسلم' کتاب الایمان' باب بیان کون النہی عن المنکر من الایمان......]

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم میں سے جو کوئی' کوئی برا کام دیکھے' پس اسے چاہیے کہ وہ اپنے زورِ بازو سے اسے روک دے۔ پھر اگر وہ اس کی استطاعت نہ رکھتا ہو تو زبان سے اس کو روکے۔ پھر اگر اس کی بھی استطاعت نہ رکھتا ہو تو دل میں اسے برا سمجھے۔ یہ آخری درجہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے''۔

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم: ((اَوْحَی اللّٰہُ عَزَّوَجَلَّ اِلٰی جِبْرَائِیْلَ عَلَیْہِ السَّلَامُ اَنِ اقْلِبْ مَدِیْنَۃَ کَذَا وَکَذَا بِاَھْلِھَا، فَقَالَ: یَا رَبِّ اِنَّ فِیْھِمْ عَبْدَکَ فُلَانًا لَمْ یَعْصِکَ طَرْفَۃَ عَیْنٍ، قَالَ: فَقَالَ: اقْلِبْھَا عَلَیْہِ وَعَلَیْھِمْ، فَاِنَّ وَجْھَہٗ لَمْ یَتَمَعَّرْ فِیَّ سَاعَۃً قَطُّ))۔

(رواہ البیہقی)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرائیل علیہ السلام کو حکم دیا کہ فلاں شہر کو اس کے رہنے والوں کے ساتھ الٹ دو۔ اس پر حضرت جبرائیل بولے: اے میرے ربّ! اس شہر میں تو تیرا فلاں بندہ بھی رہتا ہے جس نے کبھی آنکھ جھپکنے کی دیر بھی تیری نافرمانی نہیں کی۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اس بستی کو اس پر اور دوسرے رہنے والوں پر الٹ دو! کیونکہ اس کے چہرے کا رنگ ایک لمحے کے لیے بھی میری غیرت کی وجہ سے نہیں تبدیل ہوا''۔

دیگر متفرق احادیث

عَنْ مُعَاوِيَةَ ﷺ قَالَ —— وَهُوَ يَخْطُبُ —— سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ: ((لَا يَزَالُ مِنْ اُمَّتِیْ اُمَّةٌ قَائِمَةٌ بِاَمْرِ اللّٰهِ لَا يَضُرُّهُمْ مَنْ خَذَلَهُمْ وَلَا مَنْ خَالَفَهُمْ حَتّٰى يَاْتِيَ اَمْرُ اللّٰهِ وَهُمْ عَلٰى ذٰلِكَ)) [صحیح البخاری' کتاب المناقب' باب سؤال المشرکین ان یریھم النبی ﷺ آیۃ ...... وصحیح مسلم' کتاب الامارۃ' باب قولہ لا تزال طائفۃ من اُمتی......]

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے خطبہ دیتے ہوئے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ: ''میری امت میں ایک جماعت ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے حکم پر قائم رہے گی' جو شخص اسے ذلیل کرنے کی کوشش کرے گا یا اس کی مخالفت کرے گا وہ اسے کچھ نقصان نہ پہنچا سکے گا''۔

عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ ﷺ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: ((اِنَّ اللّٰهَ يَبْعَثُ لِهٰذِهِ الْاُمَّةِ عَلٰى رَأْسِ كُلِّ مِائَةِ سَنَةٍ مَنْ يُجَدِّدُ لَهَا دِيْنَهَا))

[سنن ابی داؤد' کتاب الملاحم' باب ما یذکر فی قرن المائۃ]

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''بے شک اللہ تعالیٰ ہر صدی کے اختتام پر اس اُمت کے لیے ایسے لوگ اٹھاتا رہے گا جو اس (اُمت) کے لیے دین کو تازہ کرتے رہیں گے''۔

عَنْ ثَوْبَانَ ﷺ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ : ((يُوْشِكُ الْاُمَمُ اَنْ تَدَاعٰى عَلَيْكُمْ كَمَا تَدَاعَى الْاَكَلَةُ اِلٰى قَصْعَتِهَا)) فَقَالَ قَائِلٌ: مِنْ قِلَّةٍ نَحْنُ يَوْمَئِذٍ؟ قَالَ: ((بَلْ اَنْتُمْ يَوْمَئِذٍ كَثِيْرٌ وَلٰكِنَّكُمْ غُثَاءٌ كَغُثَاءِ السَّيْلِ وَلَيَنْزِعَنَّ اللّٰهُ مِنْ صُدُوْرِ عَدُوِّكُمُ الْمَهَابَةَ مِنْكُمْ، وَلَيَقْذِفَنَّ فِيْ قُلُوْبِكُمُ الْوَهْنَ)) قِيْلَ: وَمَا الْوَهْنُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ؟ قَالَ: ((حُبُّ الدُّنْيَا وَكَرَاهِيَةُ الْمَوْتِ))

[سنن ابی داؤد' کتاب الملاحم' باب فی تداعی الامم علی الاسلام]

''حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''قریب ہے کہ

اقوامِ عالم ایک دوسرے کو تم پر ٹوٹ پڑنے کی دعوت دیں گی جیسا کہ کھانا کھانے والے ایک دوسرے کو اپنے دسترخوان کی طرف بلاتے ہیں۔'' اس پر کسی نے کہا: ''کیا اُس روز ہم تعداد میں کم ہوں گے؟'' آپ ؐ نے فرمایا: ''تعداد میں تو اُس روز تم بہت زیادہ ہو گے' لیکن تمہاری حیثیت جھاگ سے زیادہ نہ ہو گی' جیسا کہ سیلاب کا جھاگ ہوتا ہے' اور اللہ تعالیٰ تمہارے دشمنوں کے دلوں سے تمہاری ہیبت نکال باہر کرے گا اور خود تمہارے دلوں میں وہن (کی بیماری) ڈال دے گا۔'' پوچھا گیا: اے اللہ کے رسول (ﷺ)! وہن کیا چیز ہے؟ آپ ؐ نے فرمایا: ''دنیا کی محبت اور موت سے نفرت!''

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رضی اللہ عنہ **قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ** ﷺ: **((اَكْثِرُوْا ذِكْرَ هَاذِمِ اللَّذَّاتِ يَعْنِي الْمَوْتَ))** [سنن الترمذی' ابواب الزھد' باب ما جاء فی ذکر الموت۔ وسنن النسائی' کتاب الجنائز' باب کثرة ذکر الموت۔ وسنن ابن ماجه' کتاب الزھد' باب ذکر الموت والاستعداد له]

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''لذات کو ختم کرنے والی یعنی موت کو زیادہ سے زیادہ یاد کیا کرو''۔

عَنِ ابْنِ عُمَرَ رضی اللہ عنہ **قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ** ﷺ: **((اِنَّ هٰذِهِ الْقُلُوْبَ تَصْدَأُ كَمَا يَصْدَأُ الْحَدِيْدُ اِذَا اَصَابَهُ الْمَاءُ)) قِيْلَ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَمَا جِلَاءُ هَا؟ قَالَ: ((كَثْرَةُ ذِكْرِ الْمَوْتِ وَتِلَاوَةُ الْقُرْآنِ))** [رواه البیھقی فی "شعب الایمان"]

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''یہ دل اسی طرح زنگ آلود ہو جاتے ہیں جیسے لوہا پانی لگنے سے زنگ آلود ہو جاتا ہے''۔ پوچھا گیا: ''اے اللہ کے رسول ﷺ! دلوں کا زنگ کس چیز سے دور ہو گا؟ آپ ؐ نے فرمایا: ''موت کو کثرت سے یاد کرنا اور قرآن کریم کی تلاوت کرنا''۔

((وَاللّٰهِ لَتَمُوْتُنَّ كَمَا تَنَامُوْنَ، ثُمَّ لَتُبْعَثُنَّ كَمَا تَسْتَيْقِظُوْنَ، ثُمَّ لَتُحَاسَبُنَّ بِمَا تَعْمَلُوْنَ، ثُمَّ لَتُجْزَوُنَّ بِالْاِحْسَانِ اِحْسَانًا وَبِالسُّوْءِ سُوْءً، وَاِنَّهَا لَجَنَّةٌ اَبَدًا اَوْ لَنَارٌ اَبَدًا)) [نھج البلاغة]

''اللہ کی قسم! تم سب پر لازماً موت آئے گی جیسے تم سوتے ہو' پھر تمہیں لازماً دوبارہ اٹھایا جائے

گا جیسے تم بیدار ہوتے ہو' پھر تمہارا حساب کتاب ہوگا جو تم عمل کرتے رہے ہو۔ پھر تمہیں لازماً احسان کا بدلہ احسان سے دیا جائے گا' اور برائی کا بدلہ سزا سے دیا جائے گا' اور یہ (بدلہ) یا ہمیشہ کے لیے جنت ہوگی یا ہمیشہ کے لیے دوزخ ہوگی''۔

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ ؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((لَيَاْتِيَنَّ عَلٰى اُمَّتِىْ مَا اَتٰى عَلٰى بَنِىْ اِسْرَائِيْلَ حَذْوَ النَّعْلِ بِالنَّعْلِ، حَتّٰى اِنْ كَانَ مِنْهُمْ مَنْ اَتٰى اُمَّهٗ عَلَانِيَةً لَـكَانَ فِىْ اُمَّتِىْ مَنْ يَصْنَعُ ذٰلِكَ، وَاِنَّ بَنِىْ اِسْرَائِيْلَ تَفَرَّقَتْ عَلٰى ثِنْتَيْنِ وَسَبْعِيْنَ مِلَّةً وَتَفْتَرِقُ اُمَّتِىْ عَلٰى ثَلَاثٍ وَسَبْعِيْنَ مِلَّةً، كُلُّهُمْ فِى النَّارِ اِلَّا مِلَّةً وَّاحِدَةً)) قَالُوْا: وَمَنْ هِىَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ؟ قَالَ: ((مَا اَنَا عَلَيْهِ وَاَصْحَابِىْ))

[سنن الترمذی' ابواب الایمان' باب ما جاء فی افتراق ھذہ الامۃ]

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''میری امت پر بھی وہ تمام حالات آ کر رہیں گے جو بنی اسرائیل پر آئے' بالکل اسی طرح جیسے (ایک جوڑے کا) ایک جوتا دوسرے جوتے کے مشابہ ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ اگر ان میں سے کوئی (بدبخت) اعلانیہ طور پر اپنی ماں کے پاس (بدکاری کی غرض سے) آیا تو میری امت میں سے بھی ایسا ہوگا جو یہ کرے گا۔ اور بے شک بنی اسرائیل کے بہتر فرقے ہوئے' جبکہ میری اُمت کے تہتر فرقے ہوں گے۔ وہ سب کے سب دوزخ میں جائیں گے' سوائے ایک فرقہ کے''۔ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین نے پوچھا: اے اللہ کے رسول وہ کون سا فرقہ ہوگا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''وہ اس راستے پر ہوں گے جس پر میں اور میرے صحابہ ہیں''۔

OOO

مرکزی **انجمن خُدّامُ القرآن** لاہور

کے قیام کا مقصد

منبعِ ایمان ......اور...... سرچشمۂ یقین

قرآنِ حکیم

کے **علم وحِکمت** کی

وسیع پیمانے......اور......اعلیٰ علمی سطح

پر تشہیر واشاعت ہے

تاکہ امتِ مسلمہ کے فہیم عناصر میں **تجدیدِ ایمان** کی ایک عمومی تحریک برپا ہو جائے

اور اس طرح

اسلام کی نشاۃِ ثانیہ۔ اور۔ غلبۂ دینِ حق کے دورِ ثانی

کی راہ ہموار ہو سکے

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ

تنظیمِ اسلامی

مروجہ مفہوم کے اعتبار سے

نہ کوئی سیاسی جماعت نہ مذہبی فرقہ

بلکہ ایک اصولی

اسلامی انقلابی جماعت

ہے جو اولاً پاکستان اور بالآخر ساری دنیا میں

دینِ حق

یعنی اسلام کو غالب یا بالفاظ دیگر

نظامِ خلافت

کو قائم کرنے کیلئے کوشاں ہے!

امیر: **حافظ عاکف سعید**